

محمود، فاروق، فرزانه اور
انسپیکٹر جمشید سیریز
ناول نمبر 73

خونی جیل

<https://www.facebook.com/Ishtiaq.Ahmed.Novels>

<http://ishtiaqahmed-novels.blogspot.com>

اشتیاق احمد



Atlantis
Publications

منظور ہے

سینٹھ ظفر الحسن نے بے تابی کے عالم میں ایس پی عمر فرید کے نمبر گھمائے، سلسلہ فوراً ہی مل گیا۔

”ہیلو! پرنسٹنٹ صاحب! میں سینٹھ ظفر الحسن بول رہا ہوں۔“
”ہیلو سینٹھ صاحب! خیر تو ہے، آپ کی آواز میں بہت گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔“

”ہاں! پرنسٹنٹ صاحب! میرا بیٹا کل سے غائب ہے۔“
”کل سے غائب ہے، آپ سسر فاران قیصر کی بات تو نہیں کر رہے۔“
”جی ہاں! میں بہت پریشان ہوں، اگر آپ یہیں آجائیں تو تفصیل سے بات ہو سکتی ہے۔“

”نہیک ہے! میں پہنچ رہا ہوں۔“

ایس پی عمر فرید افراتفری کے عالم میں سینٹھ ظفر الحسن کی کونٹھی کی طرف روانہ ہوا، وہ سینٹھ ظفر الحسن کا دوست تھا، گھر میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا، وہ صرف پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گیا، سینٹھ ظفر الحسن کا رنگ اڑا ہوا تھا، ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی عمر اس وقت پچیس سال تھی، سینٹھ صاحب کی بیگم کے علاوہ گھر میں ظفر الحسن کا چھوٹا بھائی مسعود الحسن بھی رہتا تھا، بس یہی چار افراد تھے،

دو باتیں

اسلام علیکم!

کیمرے کا راز کیا تھا ہی آپ کو ”خونی جیل“ ملے گی، ارے ارے! ڈریپے مت، جیل میں جائیں آپ کے دشمن! اور خونی جیل میں تو دشمنوں کے بھی جائیں دشمن! آپ کہیں گے، یہ کیا بڑی بوڑھیوں کے انداز میں دو باتیں کرنے لگے، کیا کروں، کبھی کبھی بوڑھا بننے کو بھی جی چاہتا ہے، اب میں انسپکٹر جمشید کی طرح میک اپ کا ماہر تو ہوں نہیں کہ واڈھی لگا لوں گا اور بوڑھا بن جاؤں گا، لے دے کے ایسے جملوں کے ذریعے ہی یہ شوق پورا کر سکتا ہوں، ویسے شوق ہے عجیب و غریب۔ اب آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میرا دماغ چل گیا ہے، اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگ گیا ہوں، بات دراصل یہ ہے کہ میں پچھلے پندرہ دن تک بیمار رہا ہوں اور ان دنوں واقعی میں اپنا دماغ چلا ہوا محسوس کرتا رہا ہوں، یہ اور بات ہے کہ اب دماغ کو خیر ہوا محسوس کر رہا ہوں، شکر الحمد للہ۔

اشتیاق

ان کے علاوہ تین ملازم بھی تھے، ان میں ایک باورچی غلام رسول، دوسرا مالی خان بابا اور تیسرا ڈروائیور شکر تھا، یہ ہندو تھا۔

”ہاں، سیٹھ صاحب! اب بتائیے اور ذرا جلدی کیجئے تاکہ ہم فوری طور پر تلاشی شروع کر سکیں۔“ ایس پی عمر فرید نے جلدی جلدی کہا۔

”وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ فرح آباد آج سے چار دن پہلے گیا تھا، مقصد صرف سیر پانا تھا، وہاں جا کر اس نے ہوٹل انصار میں کمرہ کرائے پر لیا اور مجھے فون پر بخیریت پہنچنے کی اطلاع دی، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ تین دن تک واپس آ جائے گا، کل اس کا فون ملا کہ وہ فرح آباد سے یہاں کے لیے روانہ ہو رہا ہے.... کل رات گئے تک ہم اس کا انتظار کرتے رہے، لیکن وہ نہ آیا، میں نے یہی خیال کیا کہ شاید راستے میں کہیں رُک گیا ہے، لیکن اب تو دن بھی نکل چکا ہے، صبح کے آٹھ بج رہے ہیں۔“

”ہم ابھی تلاشی شروع کر دیتے ہیں، انشاء اللہ بہت جلد پتا چل جائے گا، فرح آباد سے دارالحکومت تک کی سڑک دیکھ ڈالی جائے گی، ویسے مجھے ڈر ہے کہ انہیں کہیں اغوا نہ کر لیا گیا ہو۔“ ایس پی عمر فرید نے کہا۔

”افوا.... کیا مطلب؟“ سیٹھ ظفر الحسن چونکے۔

”ہو سکتا ہے، اغوا کرنے والے آپ سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کریں،

ویسے مسٹر فاران قیصر نقوی کی صورت میں کتنے پیسے لے کر گئے تھے؟“

”اس کے پاس پانچ چھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہوں گے۔“

”اور اس کا دوست کون ہے؟“

”اس کے دوست کا نام اختر عباس ہے، بہت ہی غریب باپ کا بیٹا ہے،

میں نے کئی بار اسے منع کیا کہ بھوکے شکم کو دوست نہ بنائے، مگر اس نے میری

ایک نہ مانی اور پرنٹنڈنٹ صاحب! سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی گمشدگی میں اسی کا

ہاتھ نظر آتا ہے۔“

”بہت خوب! ہم اس پہلو سے بھی تفتیش کریں گے، اس کے باپ کا نام کیا ہے، پتا کیا ہے۔“ ایس پی نے پوچھا۔

”باپ کا نام خالد عباس ہے، پھل فروش ہے، سڑک پر پھلوں کا خوانچہ لگاتا ہے۔“ سیٹھ ظفر الحسن نے برا سامنہ بنایا۔

”خیر! ہم اس کا پتا معلوم کر لیں گے، اگر یہ کام اس کے بیٹے کا ہے تو بہت جلد اسے گرفتار کر لیا جائے گا، اب میں چلتا ہوں، ضروری انتظامات کرنے ہیں، ایک دو گھنٹے تک آپ کو رپورٹ دوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“

ایس پی عمر فرید وہاں سے نکل کر اپنے دفتر پہنچا اور ادھر ادھر فون کرنے کے بعد اس نے ایک اسٹنٹ کو حکم دیا:

”خالد عباس پھل فروش کو پکڑ کر یہاں لے آؤ، وہ شمالی جھونپڑوں میں کہیں رہتا ہے۔“

☆☆

ان کے دروازے کی گھنٹی بجی، چھٹی کا دن تھا اور ناشتے کے بعد وہ ابھی تک میز پر ہی بیٹھ یہ سوچ رہے تھے کہ آج کا دن کس طرح گزرا جائے، گھنٹی بجنے سے پہلے فرزانہ کہہ رہی تھی:

”میں تو انکل خان رحمان کے گھر جانا پسند کروں گی، وہاں ذرا غلوہری کی

درگت بننے دیکھیں گے، انکل کی مزے دار باتیں سنیں گے، اور حامد سردار اور ناز سے

باتیں بھی کریں گے۔“

”لیکن انکل پروفیسر داؤد کے ہاں کیوں نہ چلا جائے، وہاں شائستہ سے

گپ شپ ہو جائے گی۔“ فاروق بولا۔

”جائے کو تو ہم کہیں بھی جاسکتے ہیں.... لیکن کیوں نہ آج ہم کسی رشتے دار کے ہاں چلیں، مدت ہوئی، ہم کسی رشتے دار کے ہاں نہیں گئے، سب ہم سے ناراض رہتے ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”جاسوسی چکروں سے تمہیں فرصت ملے تو کہیں جاؤ بھی....“ بیگم جمشید نے بڑا سمانہ بنا کر کہا۔

”تو ٹھیک ہے، آج خاور محمود صاحب کے ہاں چلیں گے، ان کا کئی بار فون آچکا ہے۔“ انسپکٹر جمشید بھی خوش ہو کر بولے۔

”لیکن ابا جان! ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ خاور محمود کون ہیں۔“

”بھئی یہ رشتے میں تمہارے ماموں لگتے ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔

”صرف رشتے میں لگتے ہیں، ویسے نہیں لگتے؟“ فاروق نے حیران ہو کر

پوچھا اور وہ مسکرا دیے، عین اسی وقت گھنٹی بجی تھی۔

”بیجے، معلوم ہوتا ہے، کوئی خودی ہمارے گھر آ گیا ہے، تاکہ ہمیں نہ جانا

پڑے۔“ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

”یہ اور بھی اچھا ہے۔“ محمود جلدی سے بولا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو ایک پریشان حال لڑکی کو کھڑے پایا، اس کا لباس بہت سستا تھا، لیکن صاف ستھرا تھا، میل ٹیکیل سے بالکل پاک تھا، اس کی بڑی بڑی چمک دار آنکھوں میں گھبراہٹ اور بے قراری کے آثار صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

”کیا بات ہے، بہن! تمہیں کس سے ملنا ہے۔“ محمود نے نرم آواز میں پوچھا۔

”فرزانہ یہیں رہتی ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں! کیا تم اس کی سہیلی ہو۔“ محمود نے پوچھا۔

”نہیں! میں اس کی کلاس فیلو ہوں۔“

”کیا اس سے کوئی کام ہے۔“ محمود نے پوچھا۔

”ہاں!“ اس نے کہا، ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، محمود نے خیال کیا، شاید وہ کوئی ضرورت مند لڑکی ہے اور فرزانہ اس کی مدد کرتی رہتی ہے، اس نے سوچا، کیوں نہ اس نیک کام میں پہل کی جائے، چنانچہ بولا۔

”فرزانہ کے بجائے اگر تم اپنے بھائی اسے اپنی ضرورت بیان کر دو تو مجھے خوشی ہوگی۔“

لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا، پھر جلدی سے بولی:

”ایسی کوئی بات نہیں، میں ایک اور وجہ سے پریشان ہوں۔“

”اچھا تو اندر آ جاؤ۔“ محمود نے کہا اور اسے ساتھ لے کر ناشتے کی میز کی طرف آیا، فرزانہ نے اس لڑکی کو دیکھا اور بولی:

”میرا خیال ہے، تمہارا نام جمیلہ ہے اور تم میرے ساتھ پڑھتی ہو۔“

”ہاں! تمہارا خیال ٹھیک ہے، ہم کلاس فیلو ہیں اور میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ وہ میرے ابو کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔“ جمیلہ ایک دم رو پڑی۔

”ابو کو پکڑ کر لے گئے ہیں، مگر کون؟“ فرزانہ کی بجائے انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

”پولیس کے آدمی.... ابھی ابھی گھر آئے اور انہیں پکڑ کر لے گئے۔“

”مگر کیوں؟“ انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں، میں تو بس یہاں چلی آئی۔“ جمیلہ بولی۔

”تم لوگ کہاں رہتے ہو؟“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا.... ”والد کا نام کیا ہے؟“

”شمالی جمو نیڑوں میں.... ابو کا نام خالد عباس ہے۔“

انسپکٹر جمشید نے یہ سنتے ہی فون پر شمالی علاقے کے پولیس اسٹیشن کے نمبر

گھمے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں ان دنوں کون تعینات ہے، جلد ہی دوسری طرف سے جواب ملا:

”ایس پی عمر فرید بول رہا ہوں۔“

اور انسپکٹر جمشید کی بھنویں تن گئیں، ایس پی عمر فرید کو ان سے خدا واسطے کا پیر تھا، پھر بھی انہوں نے کہا:

”میں انسپکٹر جمشید ہوں، کیا آپ نے ابھی ابھی کسی خالد عباس نام کے آدمی کو گرفتار کر لیا ہے؟“

”بالکل کر لیا ہے، لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس پر الزام کیا ہے۔“

”ابھی تک کوئی نہیں، معاملہ یہ ہے کہ سیٹھ ظفر الحسن کا بیٹا غائب ہے، ان کا بیٹا قاران قیصر خالد عباس کے بیٹے کے ساتھ فرح آباد گیا تھا، کل وہ وہاں سے واپس روانہ ہوئے تھے، لیکن اب تک دونوں میں سے کوئی گھر نہیں پہنچا، ہمارا خیال یہ ہے کہ قاران قیصر کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اس اغوا میں خالد عباس کے بیٹے اختر عباس کا ہاتھ ہے، وہ ضرور اغوا کرنے والوں کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس کے باپ کو اس لیے پکڑ لیا ہے، تاکہ صبح کے اخبارات میں یہ اشتہار دے دیا جائے کہ اختر عباس! تمہارے باپ کو گرفتار کر لیا گیا ہے، جب تک تم خود کو پولیس کے سامنے پیش نہ کرو گے، اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جائے گا، لہذا وہ فوراً حاضر ہو جائے گا اور اس طرح قاران قیصر کا پتا معلوم ہو جائے گا۔“ ایس پی عمر فرید نے تفصیل بتائی۔

انسپکٹر جمشید کو پولیس والوں کے اس طریقے سے بڑی چٹھمی، وہ جانتے تھے کہ جو لوگ تفتیش کے فن سے ناواقف ہیں، ایسے ہی ہٹکنڈے استعمال کرتے ہیں، لہذا انہوں نے کہا:

”آپ ایسا کریں کہ خالد عباس کو چھوڑ دیں اور اخبار میں اپنی مرضی کے مطابق اشتہار دے دیں، خالد عباس کسی سے یہ نہیں کہے گا کہ اسے آزاد کر دیا گیا ہے، اس طرح آپ کے خیال میں آپ کا مجرم حاضر ہونے کے قابل ہوا تو حاضر ہو جائے گا۔۔۔“ انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

”اس طرح وہ کبھی بھی نہیں آئے گا، اخبار میں اشتہار دیکھ کر وہ پہلے اپنے گھر کا جائزہ لے گا اور جب وہاں اپنے والد کو موجود پائے گا تو غائب ہو جائے گا۔“ ایس پی بولا۔

”لیکن خالد عباس بے گناہ ہے، اسے حراست میں کس طرح رکھا جاسکتا ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”یہ کیس میرے ہاتھ میں ہے اور اسے کس طرح حل کرنا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔“

”بہت خوب! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ خالد عباس کو چھوڑ دیا جائے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے کہا۔

”اچھی بات ہے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ریسیور رکھ دیا، اور ساری بات انہیں بتائی۔

”اب کیا ہوگا، کیا ایس پی ان کے بابا کو نہیں چھوڑے گا۔۔۔“ محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

”چھڑانے کو تو میں جس وقت چاہوں، چھڑا لوں گا، خیر میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے نہ جانے کس کے نمبر ڈائل کیے، اس فون پر ساری بات بتائی اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

”آپ نے کسے فون کیا ہے؟“

”ایک دوست کو، جس کی بات ایس بی صاحب کو ماننا ہی پڑے گی، چند

منٹ انتظار کرو، وہ ابھی فون کرے گا۔“

”سوال تو یہ ہے کہ سینٹھ ظفر کا بیٹا اور جیلہ کے بھائی چلے کہاں

گئے؟“ فرزانہ نے کہا۔

”عجیب اُلوہو، یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔“ محمود جھلا اٹھا۔

”اگر انہیں اغوا کیا گیا ہے تو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا، آج کل

اغوا کرنے والے لمبی چوڑی رقم وصول کیے بغیر اپنے شکار کو نہیں چھوڑتے۔“

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی، انسپکٹر شید نے ریسپورڈ اٹھایا اور دوسری طرف

کی بات سننے لگے، آخر انہوں نے صرف اتنا کہا۔

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ریسپورڈ رکھ دیا، اور مسکراتے لگے۔

”اباجان! یہ آپ نے کیا منظور کیا ہے۔“ فاروق نے حیرت زدہ لہجے میں

کہا۔

”ایس بی عمر فرید... اس شرما پر نیلہ کے بابا کو چھوڑنے پر تیار ہوا کہ سینٹھ

ظفر الحسن کے بیٹے کو زندہ سلامت ہم واپس لائیں گے اور وہ بھی تین دن کے اندر

اندر لائیں گے۔“ انہوں نے بتایا۔

”اور آپ نے یہ منظور کر لیا۔“

”تو اور کیا کرتا۔“

”لوہی... بیٹھے بٹھائے ایک کیس مول لے لیا۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”مول تو نہیں لیا، منٹ میں مل گیا۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

”منٹ میں نہیں ملا، جیلہ کے بابا کو چھڑانے کے بدلے میں ملا ہے، خیر!

اب ہم کیا کریں گے، انہیں کہاں ڈھونڈیں گے۔“ محمود نے کہا۔

”اس کے لیے پہلے ہمیں سینٹھ ظفر الحسن سے معلومات حاصل کرنا ہوں گی،

پھر ہم فرح آباد جائیں گے۔“

”بھئی واہ! یہ بات ہوئی ثابت، لیکن اباجان! آج تو خیر چھٹی ہے اور یہ

کیس ایک دن میں ختم ہوتا نظر نہیں آتا... کل اور پرسوں کا کیا کریں گے۔“ محمود

نے اعتراض کیا۔

”اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں تنہا فرح آباد جاؤں اور تم تینوں کل

سکول جاؤ، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو دن کی رخصت لکھ دو۔“ انسپکٹر ہمیشہ بولے۔

”دوسرا طریقہ کتنا دل کش ہے، خوب صورت ہے، پیارا پیارا ہے۔“

فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”شاید تم بھول رہے ہو، ہم فرح آباد سیر و تفریح کی غرض سے نہیں، ایک

عدو کیس حل کرنے جا رہے ہیں۔“ فرزانہ نے گویا اسے یاد دلایا۔

”میں جانتا ہوں.... لیکن فرح آباد جا کر مجھے ایک کی بجائے چار کیس

بھی حل کرنا پڑے تو کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

انہوں نے جیلہ کو تو قسلی دے کر گھر بھیجا اور خود ظفر الحسن سے ملنے کے لیے

نکل کھڑے ہوئے.... جب وہ ان کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو عین اسی وقت ایک

سب انسپکٹر وہاں پہنچا اور اس نے سینٹھ ظفر الحسن کو اطلاع دی۔

”فرح آباد سے دارالحکومت تک کی تمام سڑک چھان ڈالی گئی ہے جناب!

لیکن آپ کے بیٹے کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔“

شوقا

ہوٹل انصار میں صرف دولت مند لوگ ہی ٹھہرتے تھے، اس کے ایک کمرے کا ایک رات کا کرایہ بھی ساڑھے سات سو روپے تھا، نو ابوں جیسے لباس میں ایک بوڑھا آدمی دوڑکوں اور ایک لڑکی کے ساتھ ہوٹل کے اندر داخل ہوا، بیرے ان کا سامان پہلے ہی اٹھا چکے تھے۔

”ہمیں دو کمرے درکار ہیں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”ہماری کار باہر کھڑی ہے، اسے بھی پارک میں کھڑا کر دیں، ہم دو تین دن یہاں ٹھہریں گے۔“

”بہت بہتر جناب!“ کلرک نے باادب لہجہ میں کہا اور رجسٹر کھولتے ہوئے بولا:

”آپ کا نام؟“

مجھے نواب عرفان علی کہتے ہیں، شاید تم نے یہ نام سنا ہوگا، ہم جدی پشتی نواب ہیں، کوئی نام کے نہیں، یہ ہمارے بچے ہیں، سلمان علی، رحمان علی اور ثریا علی۔“

”بہت خوب!“ کلرک نے بچوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا ان کے کپڑے بھی شاہانہ تھے، پھر وہ جلدی جلدی رجسٹر میں تمام معلومات لکھنے لگا۔

”دو ہزار روپے جمع کرادیں۔“ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”دو ہزار کیا ہوتے ہیں، دس ہزار کہو۔“

یہ کہہ کر بوڑھے نے سرخ نوٹوں کا ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف یوں اچھال دیا، جیسے وہ نعلی نوٹوں کا پیکٹ ہو، کلرک نے حیرت بھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نواب عرفان علی سے بولا:

”کیا آپ یہ سب جمع کرانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں! کیونکہ اس قسم کے اور نہ جانے کتنے پیکٹ میری جیب میں موجود ہیں، ہمارے کمروں کے نمبر کیا ہیں، ویسے اگر تم ہمیں دوسری منزل پر کمرہ نمبر دو سو دس اور گیارہ دے دو تو بہت مہربانی ہوگی، دراصل ہم جب بھی کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں.... دوسری منزل کے انہی نمبروں والے کمروں میں ٹھہرتے ہیں، یہ ایک عادت سی بن گئی ہے، اور کوئی بات نہیں۔“

”بہت خوش سے جناب! اتفاق سے یہ دونوں کمرے خالی ہیں، ابھی کل ہی خالی ہوئے ہیں۔“

”بھئی واہ مزہ آگیا، تم بے فکر رہو، ہم تمہیں شاندار قسم کی ٹپ دیں گے۔“

نواب عرفان نے خوش ہو کر کہا۔

”بہت بہت شکریہ جناب! بیرے آپ کا سامان ابھی وہاں پہنچا دیتے ہیں، آئیے میں خود آپ کو اوپر تک چھوڑ آؤں۔“

وہ اس کے ساتھ چلتے لفٹ تک آئے اور اس میں سوار ہو کر دوسری منزل پر اترے، کلرک نے ان کے کمرے کھول دیے اور وہ اندر داخل ہوئے، اسی وقت نواب عرفان نے تاک چڑھا کر کہا:

”معلوم ہوتا ہے، اس کمرے میں آج کل کے نوجوانوں میں سے کوئی نوجوان ٹھہرا ہوا تھا۔“

”آپ نے کیسے جانا؟“ کلرک حیران ہو کر بولا۔

”میں کمرے میں پھیلی ہوئی خوشبوؤں کو سونگھ کر بتا دیا کرتا ہوں کہ کس قسم کا آدمی کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔“ نواب صاحب نے شوخ لہجے میں کہا۔

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ کلرک جلدی سے بولا۔

”میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اس کمرے میں ٹھہرنے والے دونو جوان تھے، اب پھر حیران ہو کر پوچھو گے کہ میں نے یہ کس طرح جانا، تو سنو، تمہارے صفائی کرنے والے نے فرش اچھی طرح صاف نہیں کیا، اس پر دو مختلف جوتوں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔“ نواب صاحب نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

”واقعی آپ بہت ذہین ہیں، وہ دو ہی نو جوان تھے، یہ کمرے انہوں نے کرائے پر لیے تھے۔ حالانکہ ایک کمرے میں بھی ان کا گزارا ہو سکتا تھا، لیکن شاید ان کے پاس بھی آپ کی طرح دولت بے تحاشہ تھی۔“ کلرک نے کہا۔

”وہ کل یہاں سے گئے تھے؟“ نواب صاحب نے جلدی سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اور میرا خیال ہے کل صبح سویرے چلے گئے ہوں گے، شاید افراتفری کے عالم میں گئے تھے۔“

”یہاں آپ کا اندازہ غلط ہو گیا، وہ کل شام یہاں سے روانہ ہوئے تھے، اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، دونوں گھبرائے ہوئے بالکل نہیں تھے۔“

”خیر خیر.... اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں، اچھا یہ نو اور اب ہم ذرا آرام کریں گے۔“ یہ کہہ کر نواب رحمان نے جیب سے پھر ایک سرخ نوٹوں کا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک نوٹ کھینچا اور کلرک کی طرف بڑھا دیا۔ کلرک نے پچھنی پچھنی آنکھوں سے نوٹ کو دیکھا اور پھر یوں اچک لیا جیسے اسے شک ہو، کہیں نواب کا ارادہ نہ بدل جائے، پھر وہ انہیں سلام کر کے چلا گیا، اس کے جاتے ہی ان میں سے ایک

لڑکے نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”چارہ ڈال دیا ہے، اب مچھلی چارے پر منہ مارنے کے لیے تیار ہے۔“ نواب نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور یہ آواز انسپکٹر جمشید کی تھی۔

”کمرے کے نمبر تو ہمیں سینٹھ ظفر الحسن سے معلوم ہو گئے تھے، باقی معلومات آپ نے کلرک سے حاصل کر لیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ دونوں تو یہاں سے چلے گئے تھے۔“ محمود نے کہا۔

”انہیں جس نے بھی غائب کیا ہے، وہ بھی یہیں موجود رہا ہوگا، اس نے دیکھا ہوگا کہ دونوں نو جوانوں میں سے کم از کم ایک موٹی آسامی ہے، لہذا ان کے یہاں سے روانہ ہونے کے بعد دارالحکومت کی طرف جانے والی سڑک پر کسی جگہ انہیں غائب کر دیا گیا، وہ سڑک سورج غروب ہونے کے بعد سنسان ہوتی ہے، یہ سارا چکر اس لیے چلایا ہے کہ سڑک پر وہ مقام ہمیں معلوم ہو جائے۔“

”لیکن وہ تو اسی صورت میں معلوم ہوگا، جب وہ لوگ ہمیں بھی غائب کرنے کا پروگرام بنالیں۔“ فرزانہ بولی۔

”وہ بنائیں گے اور ضرور بنائیں گے، نوٹوں کے پیکٹ کی جھلک اسی لیے تو دکھائی ہے۔“

”آخر آپ ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے نوٹ کہاں سے لے آتے ہیں۔“ فاروق نے سوال کیا۔

”دفتر سے ایسے موقعوں کے لیے ضرورت کے مطابق نوٹ لیے جاسکتے ہیں، بعد میں مجرموں سے وصول کر کے وہاں کا میزان پورا کر ہی دیا جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، یہ نقلی نہیں ہیں۔“

”نہیں! ضرورت کے مطابق نقلی بھی لیے جاسکتے ہیں۔“ انہوں نے کہا،

پھر اٹھتے ہوئے بولے:

”پہلے میں ہوٹل سے باہر ایک چکر لگاؤں گا۔ کار پر بھی ایک نظر ڈال لوں گا، تمہارے انکل رحمان کی کار کو کسی مناسب جگہ پارک ہونا چاہیے اور یہ بھی اندازہ لگا لوں گا کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے لگ چکے ہیں یا نہیں۔“

”بہت خوب! آپ جانیے، ہم تو ذرا کریں سیدھی کریں گے۔“ محمود نے

انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”یہ ہماری کمزوری کب سے ہو گئیں، میری بات سن کر تم اب یہ کہو

گے کہ یہ محاورہ ہے، جواب میں میں کہوں گا، آخر بات بے بات محاورے ہی کیوں بولے جاتے ہیں، کیا ان کے بغیر ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا، یا رات کو نہ سکون نیند نہیں آتی....“ فاروق نے منہ بنا کر کہا اور انسپکٹر جمشید مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

”اور یہ بات بے بات کی محاورہ نہیں۔“ محمود نے جل بھن کر کہا۔

”ارے ہائیں! تو کیا یہ بھی محاورہ ہے، لا حول ولا قوۃ.... یہ محاورے بھی

عجیب چیز ہیں، اونٹ کی طرح منہ اٹھائے گفتگو میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں، لاکھ روکنے پر بھی نہیں رکتے۔“ فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

”اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ اونٹ کی طرح منہ اٹھا کے

چلے آنا بھی محاورہ استعمال ہوتا ہے۔“

”ارے باپ رے! یہ محاورے تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

فاروق نے جلدی سے کہا۔

”بس محمود! اب یہ نہ کہنا کہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑنا بھی محاورہ ہے، ورنہ میں تم

دونوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاؤں گی، آخر بیچارے محاوروں کی ہی شامت کیوں، ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے اور بھی کئی موضوع ہیں اور ان میں سب سے اہم

موضوع سینٹ فلپس کا بیٹا فاران قیصر ہے، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں اسے کچ بچ جیل کے بھائی اختر عباس نے ہی غائب نہ کر دیا ہو، ہو سکتا ہے، اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں۔“ فرزانہ جلدی جلدی کہتی چلی گئی۔

”اگر وہ مجرم ہے تو بچ نہیں سکے گا، ہم بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔“ محمود بولا۔

”کیوں نہ ہم انکل اکرام کو فون کر کے معلوم کریں، کیا خبر فاروق قیصر اپنے گھر پہنچ نہ گیا ہو، ابا جان انہیں معلومات حاصل کرتے رہنے کی ہدایت تو کر ہی آئے تھے۔“ فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں، فون کرے میں موجود ہی ہے۔“

محمود نے ابھی فون کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، انسپکٹر جمشید کو گئے تو ابھی ایک آدھ منٹ ہی ہوا تھا، وہ تو اتنی جلدی لوٹ کر نہیں آ سکتے تھے، دوسرے ہوٹل کا کوئی پیرہ بھی بلائے بغیر نہیں آ سکتا تھا، اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آنے والا کوئی اور ہی ہے، آخر محمود اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆

انسپکٹر جمشید لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترے، ہال میں بہت سے آدمی چائے اور دوسروں چیزوں سے شغل کر رہے تھے، انہوں نے ایک نظر سب پر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھے۔ اچانک کاؤنٹر کلرک کی نظر ان پر پڑی۔

”ارے! آپ نے تو کہا تھا اب آپ ذرا آرام کریں گے، کیا کوئی خاص کام آپ پڑا ہے۔“

”نہیں! میں یہ دیکھنے کے لیے اتر رہا ہوں کارٹھیک جگہ پارک کی گئی ہے یا

نہیں۔“ انہوں نے بھی چونک کر کہا، کیونکہ انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ کلرک سے یہ بات کہہ چکے ہیں۔

”آپ فکر نہ کریں، کار بالکل مناسب جگہ پارک کرادی گئی ہے۔“
”میں اپنا اطمینان کرنا چاہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکل گئے، اسی وقت ایک میز سے دو آدمی اٹھے اور لفٹ کی طرف بڑھے، اسی میز سے دوسرا آدمی اٹھا اور ہال سے باہر نکل گیا، کلرک نے یہ دیکھ کر تیزی سے پلکیں جھپکائیں اور بڑبڑایا:

”انسپکٹر جمشید نے باہر نکل کر کار کو دیکھا بھالا، پھر مڑے ہی تھے کہ ایک آواز نے چونکا دیا:

”نواب صاحب! آپ کو کوئی داؤ شاذ لگانے کا بھی شوق ہے۔“

”داؤ.... کس قسم کا داؤ۔“ انہوں نے حلق سے ایک بوڑھے کی آواز نکالی۔ ”اگر تمہارا مطلب کشتی کے داؤ پیش سے ہے تو میں بیسیوں داؤ جانتا ہوں، جو ڈوکر اٹے اور جو جھٹو کے داؤ بھی مجھے آتے ہیں۔“

”میرا مطلب تاش کی بازی سے تھا۔“ ان کے سامنے کھڑے نوجوان نے کہا، یہ ایک موٹے جسم کا بھاری سا آدمی تھا، اگر قد لمبا نہ ہوتا تو گیند جیسا نظر آتا۔
”ارے! یہ تو ہمارا روز کا کام ہے، اکیلے ہی ہو یا ساتھ کوئی اور بھی ہے۔“

”میرے دو دوست اور ہیں۔“

”چلو اوپر کمرے میں چل کر کھیل شروع کرتے ہیں۔“

”لیکن ہم یہاں بے ایمانی نہیں کرنے دیتے، نہ خود کرتے ہیں۔“ اس نے کہا۔
”کیا تمہارا خیال ہے، میں بے ایمانی کروں گا۔“ انسپکٹر جمشید نے

آنکھیں نکالیں۔

”میں نے حقیقت بتادی ہے، بُرا ماننے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے کہا۔
”ٹھیک ہے، کیا تمہارے پاس نقد رقم ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔
”بالکل ہے، میرے اور میرے ساتھیوں کے پاس تقریباً دس ہزار تو ضرور موجود ہوں گے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر آؤ۔“

”رقم میزے کمرے میں پڑی ہے، میرا کمرہ چلی منزل میں ہی ہے، آپ ہال میں ٹھہریں، میں رقم نکال کر لاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ دونوں ہال میں داخل ہوئے، انسپکٹر جمشید ایک خالی میز پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے، ساتھ ہی وہ سوچ رہے تھے، یہ کیا چکر شروع ہو گیا ہے، وہ تو یہاں سینٹھ ظفر الحسن کے بیٹے کی تلاش میں آئے تھے، اس کا تو اب تک کوئی سراغ لگ نہیں سکتا تھا، اور یہ جواری لوگ پلے پڑ رہے تھے۔

”خیر کوئی بات نہیں، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو....“ وہ بڑبڑائے،
”موٹے کو گئے کئی منٹ گزر چکے تھے، نہ جانے وہ وہاں کیا کرنے لگ گیا تھا، انہیں یاد آیا، ابھی تک اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا، وہ اس بارے میں سوچنے لگے، پھر اچانک اٹھے اور کاؤنٹر کلرک کی طرف آئے، وہ انہی کو دیکھ رہا تھا:

”اس موٹے آدمی کو جانتے ہو، جو ابھی ابھی اندر گیا ہے۔“

”جی ہاں! یہ یہاں کا مشہور جواری ہے، یہاں آنے والے نوابوں اور سیٹھوں کو جوئے کی دعوت دیتا ہے اور پھر ان سے لمبا جوا کھیلتا ہے۔“

”بے ایمانی تو ضرور کرتا ہوگا۔“

”اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ اس نے کبھی بے ایمانی کی ہو۔“ کلرک بولا۔

روپے کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی فاروق اور فرزانہ نے بھی دس روپے والے نوٹ نکال کر اسے دیے۔

”تھوڑی دیر بعد ہمارے ابا جان یہاں آنے والے ہیں، شاید وہ بھی تمہاری کچھ مدد کریں، اس لیے تم ایک گھنٹے بعد پھر آیا۔“ فرزانہ بولی۔

”جی بہت اچھا۔“ اس نے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

”خدا جانے کیا چکر چل رہا ہے۔“ فرزانہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے

دبی آواز میں کہا۔

”چکر.... لیکن کہاں، یہاں تو مجھے کوئی چکر و کر چلنا نظر نہیں آ رہا۔“

فاروق کے منہ سے نکلا۔

”اب تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہو تو میں کیا کروں۔“ فرزانہ نے بتایا۔

”تو لاؤ! تمہاری نظر سے دیکھ لیتا ہوں۔“ فاروق مسکرایا۔

”چکر تمہیں پھر بھی نظر نہیں آئے گا۔“

”بات کیا ہے فرزانہ۔“ محمود نے پوچھا۔

”آہستہ آواز میں بات کرو، میں خطرے کی بو محسوس کر رہی ہوں۔“

فرزانہ بولی۔

”تو کیا زور سے بولنے کی صورت میں خطرے کی بو پھر ہو جائیگی۔“

فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں اور ساتھ میں تمہیں بھی لے اڑے گی۔“ فرزانہ جل کر بولی۔

”میں اڑتے وقت محمود کا ہاتھ پکڑ لوں گا اور تم اس کے پاؤں سے لٹک

جانا، اس طرح ہم تینوں ہوا میں اڑنے کا لطف اٹھا سکیں گے۔“ فاروق نے کہا۔

”فرزانہ! آخر تم کس قسم کے خطرے کی بو محسوس کر رہی ہو۔“

”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہمارے گرد جال پھیلایا جا رہا ہے اور اس

جال کا گھیرا لہجہ بلکہ تنگ ہوتا جا رہا ہے....“ اس نے کہا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، ارے دماغ میں وہم کا جال بچکا چلا جا رہا

ہے اور اس جال کا گھیرا لہجہ تنگ ہو رہا ہے۔“ فاروق بولا۔

”آخر تم اس نتیجے پر کس طرح پہنچی ہو۔“ محمود نے الجھ کر پوچھا۔

”ابھی جو آدمی امداد مانگنے آیا تھا، اس کا لباس اگرچہ بہت گھنٹا تھا، لیکن اس

کے پیروں میں اس قدر قیمتی جوتے تھے کہ امیر آدمی بھی مشکل سے خریدتے ہوں

گے۔“

”اوہ! دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، پھر محمود نے چونک کر کہا:

”اس نے بتایا تھا کہ وہ یہاں آنے والوں سے امداد مانگتا رہتا ہے، کیا خبر

کسی رئیس نے اسے اپنے جوتے دے دیے ہوں۔“

”لیکن جوتے بالکل نئے تھے اور رئیس لوگ بالکل نئے جوتے دوسروں کو

نہیں دیا کرتے، بلکہ کچھ پرانے ہونے کے بعد دیا کرتے ہیں۔“ فرزانہ نے جواب

میں کہا۔

”سوال یہ ہے کہ ہمارے گرد جال....“

محمود کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی

تھی، انداز انپیکٹر جمشید کا تھا، وہ تیزی سے مڑے اور محمود نے چٹختی گرا دی، انہوں نے

دیکھا، انپیکٹر جمشید تین دوسرے آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

”ہم یہاں جو اٹھیں گے، اگر تم چاہو تو نیچے ال میں چلے جاؤ اور اگر پسند

کر دو تو یہیں ٹھہرو۔“ انپیکٹر جمشید نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”جی... جوا!“ تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”ہاں جہاں لوگوں نے دعوت دی اور میں نے قبول کر لی۔“
 ”ٹھیک ہے، آپ کھیلیں، ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔“ محمود ان کا مطلب سمجھ کر بولا، وہ جان گیا تھا کہ ان کے والد انہیں کمرے سے باہر بھیجتا چاہتے ہیں، چنانچہ تینوں وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔
 ”جال اور تنگ ہوتا نظر آرہا ہے۔“ فرزانہ فکر مند لہجے میں بولی۔
 ”کیا بار بار جال کا ذکر کر رہی ہو، ہم کوئی پرندے ہیں۔“ فاروق نے بھنا کر کہا۔

”اور یہ جوئے کی دعوت جال میں پھانسنے کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔“
 فرزانہ نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔
 ”آخر ہمیں جال میں کیوں پھانسا جائے گا۔“ محمود نے سوال کیا۔

”ابا جان یہاں ایک نواب کے روپ میں وارد ہوئے ہیں اور انہوں نے سرخ پیکٹ کی جھلکیاں بھی دوسروں کو دکھائی ہیں، میرا خیال ہے، یہ سارا چکر ان نوٹوں کی وجہ سے چلایا جا رہا ہے۔“

”لیکن ہم تو یہاں سیٹھ ظفر الحسن کے بیٹے کی تلاش میں آئے تھے، اس کا تو کہیں نام و نشان تک نہیں ملا اور ہمارے ساتھ پکڑ چلنا شروع ہو گیا۔“ محمود نے اعتراض کیا۔

”ابا جان کے ذہن میں بھی ضرور کوئی پروگرام ہے، وہ بلاوجہ تو نواب کے روپ میں یہاں نہیں آ گئے۔“ فاروق نے کہا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ آج پھر میرے کانوں میں کچھ سرسراہٹ اٹھی ہے۔“ فرزانہ دھیرے سے مسکرائی۔

”کیا مطلب؟“ وہ دونوں ایک ساتھ چونک کر بولے۔

”مطلب یہ کہ جس وقت وہ غریب آدمی ہم سے باتیں کر رہا تھا، مجھے ساتھ والے کمرے سے بہت ہلکی سی آوازیں آئی تھیں، جب کہ اوپر آنے سے پہلے میں ہوٹل کے کمروں کی تفصیل بتانے والے بورڈ پر دیکھ چکی ہوں، کمرہ نمبر دوسونو میں کوئی شخص ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔“

”تم.... تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ محمود نے جلدی سے پوچھا۔
 ”میں.... میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ...“ فرزانہ نے اسی کے انداز میں کہنا شروع کیا اور وہ اسے بڑی طرح گھورنے لگا۔ ”کہ وہ غریب آدمی جب ہمارے سامنے کھڑا تھا تو کمرہ نمبر ۲۰۹ میں کچھ گڑبڑ کی جا رہی تھی۔“ فرزانہ نے بات مکمل کی۔
 ”مجھے یقین آ گیا۔“ فاروق نے ایک دم کہا۔

”کس بات پر یقین آ گیا، اس پر کہ کمرہ نمبر دوسونو میں کوئی گڑبڑ ہو رہی تھی۔“

”نہیں! اس بات پر یقین آ گیا کہ فرزانہ ضرور خوفناک قسم کے وہم کا شکار ہو گئی ہے۔“

”یہ جاننے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں وہم کا شکار ہو گئی ہوں یا نہیں اور وہ یہ کہ آؤ کمرہ نمبر دوسونو میں گھس کر دیکھ لیں۔“ فرزانہ نے کہا۔
 ”اگر دروازے میں تالا لگا ہوا تو؟“ فاروق بولا۔

”تو میں اپنی میسرین محمود کو دے دوں گی۔“ فرزانہ مسکرائی۔
 ”بہت خوب! یہ ہوئی نا بات، یا محمود، اس کی میسرین کہیں سونے کی تو نہیں۔“ فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں بھائی! اس کا مطلب تو یہ تھا کہ میں میسرین پن سے تالا کھول دوں گا۔“ محمود مسکرایا۔

”پلو پھر، یہی کر لیتے ہیں۔“

تینوں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکلے اور دوسو دس کے پاس سے ہوتے ہوئے دوسو نو کے دروازے پر آئے، انہوں نے آہستہ سے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا، وہ بند تھا، فرزانہ نے جلدی سے ہیر پن محمود کو دے دی اور وہ تالے پر جھک گیا، فاروق اور فرزانہ اس کے دائیں بائیں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ برآمدے میں ادھر ادھر سے آنے والے کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ محمود کیا کر رہا ہے۔

”اگر ایسے میں کوئی ادھر نکل آیا اور پوچھ بیٹھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں تو کیا جواب ہوگا۔“ فرزانہ نے پوچھا۔

”کہہ دیں گے، ہماری پھنی گر گئی ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”دھت تیرے کی، پھنی سے بڑی چیز نہیں کہہ سکتے تم۔“ محمود نے جھلا کر

راں پر ہاتھ مارا۔

”پھنی سے بڑا روپیہ ہوتا ہے اور اسے تلاش کرنے کے لیے اس قدر باریک بینی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ فاروق نے بھی تڑ سے جواب دیا، پھر بولا۔

”وہی تم کہو تو میں کہہ دوں گا کہ اشرفی گر گئی ہے۔“

”لیکن یہ اشرفیوں کا زمانہ کہاں ہے؟“ فرزانہ نے منہ بتایا۔

”بھئی ہم پرانے زمانے کے سکے جمع کرنے کے شوقین ہیں۔“ فاروق

بولا۔

”اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔“

”اچھا خاموش! کچھ ٹھیک یا غلط نہیں رہے گا، کیونکہ تالا کھل گیا ہے۔“ محمود

نے کہا۔

”مگر ہم نے آواز نہیں سنی۔“ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

”تھوڑی دیر پہلے تو تمہارے کانوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔“ فاروق نے مذاق اڑایا۔

”شاید یہ تالے اسی قسم کے ہیں.... لو میں دروازہ دھکیلنے لگا ہوں، دبے پاؤں اندر داخل ہوتا ہے۔“

محمود نے کہا اور دروازے پر دباؤ ڈالا، وہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا، یہاں تک کہ ایک آدمی کے اندر داخل ہونے کا راستہ بن گیا۔

تینوں اس طرح دبے پاؤں اندر داخل ہوئے کہ بالکی سی آہٹ بھی نہ ہو سکی، انہوں نے دیکھا کہ ان کے کمرہ نمبر دوسو دس کی دیوار سے ایک شخص آنکھ لگائے بیٹھا ہے۔

یہ دیکھ کر وہ تنگ رہ گئے، پھر آہستہ آہستہ چلتے اس کی مین کمر کے پاس پہنچ گئے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے دوست؟“ فاروق نے جھک کر اس آدمی کے کان پر منہ رکھ کر سرسراہتی آواز میں کہا۔

وہ بڑے زور سے اچھلا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئی۔

☆☆

چاروں میز کے گرد بیٹھ گئے، شوقا پتے نکال کر بھیٹنے لگا، پھر کھیل شروع ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید پوری ہوشیاری سے کھیلنے لگے، لیکن اس کے باوجود وہ پہلی بازی ہار گئے، دوسری مرتبہ پتے تقسیم کئے گئے، اس بار بھی وہ ہار گئے، پہلی مرتبہ شوقا جیتا تھا، دوسری بار اس کا ساتھی، انسپکٹر جمشید نے بغور ان تینوں کا جائزہ لیا، وہ جان گئے تھے کہ تینوں کوئی چالاک کر رہے ہیں، لیکن کیا.... یہ انہیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا، پھر

وہ تیسری اور چوتھی بازی بھی ہار گئے، اس وقت تک وہ چھ ہزار روپے کے قریب ہار چکے تھے، اس کے باوجود ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آٹھ بازیاں ہار گئے، ان کے مقابل تین کھلاڑیوں میں ایک ضروران کے مقابلے میں جم جاتا تھا، باقی دو پتے پھینک دیتے تھے، لیکن جو مقابلے میں جم جاتا تھا، بازی اسی کے ہاتھ رہتی تھی اور یہ ان کے لیے حیرت انگیز بات تھی، اچانک انسپکٹر جمشید نے ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار دیکھے، انہیں حیرت ہوئی کہ کس بات نے انہیں پریشان کر دیا ہے، نویں بازی میں ان کے اعتماد کا وہ حال نہیں رہا تھا، انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچا اور بڑھ چڑھ کر رقم لگا دی اور یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا کہ وہ یہ بازی جیت گئے، دسویں بازی بھی وہ جیت گئے اور پھر مسلسل جیتنے لگے، یہاں تک کہ ان کے سامنے میز پر نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا، شوفا اور اس کے ساتھیوں کی پیشانیوں پر پسینے کے قطرے چکنے لگے، انہوں نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور داؤ لگایا، لیکن ان کے حق میں یہ بازی بھی چوٹ رہی اور انسپکٹر جمشید کے ڈھیر میں اور اضافہ ہو گیا۔

”یہ تم کیا کھیل کھیل رہے ہو، نواب صاحب!“ اچانک شوفا نے پتے میز پر پٹختے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، تاش کے اس کھیل کو فلیش کہتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”میں تاش کے کھیل کی نہیں، تمہارے اس کھیل کی بات کر رہا ہوں، جو تم ہمارے ساتھ کھیل رہے ہو، تمہارے پاس ضرور دوسرے پتے ہیں۔“

”جب تم دھڑا دھڑ جیت رہے تھے، اس وقت میں نے تو یہ بات نہیں کہی تھی۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”یہ تمہاری چالاکی تھی، شروع میں ہارتے چلے گئے اور پھر اچانک چالاکی شروع کر دی۔“

”خیر! تم یوں کرو کہ میری تلاشی لے لو، اس طرح تمہیں خود بخود یقین آجائے گا کہ میں بے ایمانی کر رہا ہوں۔“

”ہم یہ کام ضرور کریں گے، ہاتھ والے پتے میز پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔“ انہوں نے ایسا ہی کیا، شوفا نے اٹھ کر ان کی تلاشی لی، اور پھر جھٹکا کر بیٹھ گیا۔

”حیرت ہے، آج تک ایسا نہیں ہوا؟“

”کیا تم ہمیشہ جیتتے ہی رہے ہو۔“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”ہاں! ہمیں آج سے پہلے کوئی نہیں ہراسکا۔“

”ہم سے پہلے جو دونو جوان یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، کیا وہ بھی تمہارے ساتھ کھیلے تھے اور ہارے تھے؟“

”کیوں! تم نے یہ کیوں پوچھا۔“ شوفا کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس یونہی، کیا تم اس سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتے۔“ انہوں نے

سوال کیا۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، ہم نے انہیں کھیلنے کی دعوت ضرور دی تھی، لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا، ان کا کہنا تھا، وہ جو کبھی نہیں کھیلتے۔“

”بہت خوب! تب تو وہ بہ شریف نو جوان تھے، جو واقعی بہت بُری چیز ہے، ایک لعنت ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”تب آپ کیوں کھیلتے ہیں۔“

”کہاں کھیلتا ہوں، تم نے دعوت دی اور میں منظور کر بیٹھا، یقین جانو میں تو

حرام کی دولت کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا... اب اس وقت بھی جو دولت میں نے تم سے جیتی ہے، وہ تمہیں لوٹا رہا ہوں۔“

یہ کہا اور اپنے نوٹ الگ کرنے لگے، تینوں انہیں اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں، پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے نوٹوں کا ایک ڈھیر ان کی طرف بڑھا دیا اور اپنے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے، وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہے تھے، یہ دیکھ کر انہیں جھشید مسکرائے اور بولے۔

”کیا دیکھ رہے ہو دوستو! میرے نزدیک ان نوٹوں کی حیثیت رومی کا غلہ کے ٹکڑوں سے زیادہ نہیں، میرے پاس اتنی دولت ہے کہ آج تک گن نہیں سکا، نہ جانے کتنے بنکوں میں حساب کتاب ہے، کہو تو چیک بکیں تمہیں دکھا دوں، ساتھ لیے پھرتا ہوں، مجھے جوئے سے نفرت ہے اور تمہیں بھی سبق دینا چاہتا تھا کہ جائز طریقوں سے روزی کماؤ، ان کاموں میں کیا رکھا ہے۔“

”تم... تم کون ہو دوست... کچ بٹاؤ۔“ اچانک شوقا سانپ کی طرح پھینکا را، ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک لمبے پھل والا چاقو نظر آیا، چاقو کی نوک اس نے ان کے سینے پر رکھ دی، عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

☆☆☆

زبان کا پرزہ

اس کے اچھلنے پر انہوں نے دیکھا، دیوار میں ایک سوراخ تھا، اور اس سوراخ کے پاس شینڈ پر خوردبین کی قسم کا ایک آلہ فٹ تھا، شاید وہ اس میں سے دوسرے کمرے میں ہونے والے کھیل کا جائزہ لے رہا تھا، دیوار پر کچھ مٹن بھی لگے تھے۔

”ہوں! تو تم یہاں سے اپنے ساتھیوں کو بتا رہے ہو کہ کس کے ہاتھ میں کیا ہے۔“ محمود نے اسے گھورا۔

”یہ غلط ہے، میں تو یہاں سے صرف کھیل دیکھ رہا ہوں، بھلا بتا کیسے سکتا ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”بتانے کے لیے بھی یہاں کچھ نہ کچھ انتظام کر رکھا ہوگا۔“

یہ کہہ کر محمود آگے بڑھا، اس نے اس کی بھی پروا نہ کی کہ کہیں وہ اس پر جھپٹ نہ پڑے اور آنکھ خوردبین سے لگا دی۔ اسے دوسرے کمرے کا منظر بہت صاف نظر آیا اور مزے کی بات یہ کہ اس کمرے میں موجود چاروں آدمیوں کے ہاتھوں میں جوپے تھے، وہ بھی بالکل صاف نظر آرہے تھے۔

”حیرت ہے، اس خوردبین میں سے چاروں کے پتے کیسے نظر آسکتے ہیں، جب کہ سامنے کے رخ دو آدمیوں کے پتے نظر آتے ہیں۔“ محمود کے منہ سے نکلا، یہ

سن کر فرزانہ آگے بڑھی..... اس نے بھی خوردبین میں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی، اب فاروق سے بھی نہ رہا گیا، اس نے بھی آگے بڑھ کر دوسرے کمرے کا منظر دیکھا۔ سوچ کے عالم میں کئی لمحے گزر گئے، کمرے میں موجود آدمی کو انہوں نے اس طرح نظر انداز کر دیا تھا، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو، یہ دیکھ کر دروازے کی طرف کھینکے لگا، محمود نے فوراً بھانپ لیا، وہ تیز سے دروازے کی طرف بڑھا اور چٹختی لگا دی۔

”تم ایسے نہیں جاسکتے دوست۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”یہ بھی بتا دو کہ کیسے جاسکتا ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”میری سمجھ میں آ گیا، چاروں آدمیوں کے تاٹش کس نظر آ سکتے ہیں۔“

اچانک فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

”میں پہلے ہی یہ سمجھتا تھا کہ تمہاری ہی سمجھ میں آئے گا، ہم نے تو شاید اپنی

عقلیں بچ کھائی ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”دوسرے کمرے کی سامنے والی دیوار پر کوئی ننھا سا آئینہ لگا ہوا ہے، اس

آئینے میں سامنے والے دونوں کھلاڑیوں کے پتے آ جاتے ہیں اور اس کا عکس اس

آلے میں بھی نظر آتا ہے، جہاں کی دکانوں پر اور میک اپ روموں میں آئینے در

آئینے لگے ہوتے ہیں اور ان میں عکس در عکس نظر آتے ہیں، کیوں کیا خیال ہے۔“ یہ

کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی۔

”بہت نیک خیال ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے نیک خیال ہو ہی نہیں

سکتا، یوں بھی بے چارہ خیال بد کیسے ہو سکتا ہے۔“ فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

”چل پڑی زبان؟“

”چلانے کے لیے اور میرے پاس رکھا ہی کیا ہے، سائیکل نہ کار، ہوائی

جہاز نہ راکٹ۔“ فاروق بولا۔

”خدا نہ کرے تمہارے پاس یہ چیزیں ہوں، ورنہ.....“ فرزانہ کہہ رہی تھی کہ محمود نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میرا خیال ہے، پہلے ہمیں اس شریف آدمی سے دو دو باتیں کر لینی چاہئیں، پھر بے شک تم اپنی اوٹ پناہنگ باتیں کرتے رہنا۔“

”چلو ٹھیک ہے، ہاں تو مسٹر شریف آدمی... تم یہ کیا غیر شریفانہ حرکت کر رہے تھے اور ہاں اب یہ بھی بتا دو کہ اپنے ساتھیوں کو یہ کس طرح بتاتے ہو کہ کس کے ہاتھ میں کیا ہے۔“ فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔

”اس کمرے میں چاروں طرف مہرچ جتنے چار بلب خفیہ طور پر لگے ہوئے ہیں، ان میں ایک کا رنگ سرخ ہے، دوسرا نیلا تیسرا زرد اور چوتھا سبز ہے، جس کے ہاتھ میں جیتنے والے پتے ہوتے ہیں، میں اس کا بلب دیتا ہوں، مسٹر شوفا کا بلب سرخ ہے، ان کے ایک ساتھی کا نیلا اور دوسرے کا سبز، باہر کے آدمی کو زرد رنگ دیا جاتا ہے، اگر باہر کے آدمی دو ہوں تو زرد اور نیلا بلب ان کے ہوں گے۔“

”بہت خوب! تو اس طرح تم لوگوں کو ٹھکتے ہو، لیکن اب یہ کھیل جاری نہیں رہ سکے گا۔“

”یہ کھیل اسی طرح جاری رہے گا اور تم جیسے جانور اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے۔“ اس نے پہلی مرتبہ عجیب سی آواز میں کہا، ورنہ اس وقت تک تو وہ بھیگتی ملی بنا رہا تھا اور وہ تینوں خیال کرتے رہے تھے کہ شاید کوئی بہت ہی بزدل آدمی ہے۔

”کیا مطلب! تم کس طرح یہ بات کہہ سکتے ہو۔“ فرزانہ چونکی۔

”اس طرح کہ پولیس کے بڑے بڑے افسر اس کام میں شامل ہیں، انہیں حصہ ملتا ہے، لہذا یہ کھیل جاری رہے گا۔“

”ہوں! اور اگر ہم اس ہوٹل کو ہی بند کر دیں تو....“

”تو ہوٹل کا مالک کوئی اور ہوٹل کھول لے گا، لیکن پہلے تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم ہوٹل بند کر اسکو۔“ اس نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو، ہم ایسے سوالات پیدا کرنے کے ماہر ہیں، ویسے یہ تم اچانک بھیگی بلی سے شیر کس طرح بن گئے۔“ فاروق نے کہا۔

”تم مجھے یہیں جانتے.... میرا نام ارسلان تیمور ہے، خالص تیموری خون دوڑ رہا ہے میری رگوں میں۔“ اس نے کہا۔

عین اسی وقت دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا، ساتھ ہی انہوں نے محسوس کیا کہ دوسرے کمرے کے دروازے پر بھی دستک دی گئی تھی۔

☆☆

دستک کی آواز سن کر شوقا اور اس کے ساتھی چونک اٹھے پھر شوقا نے اپنے ایک ساتھی سے کہا:

”دروازہ کھولنے سے پہلے یہ پوچھ لو کہ کون ہے۔“

”بہت اچھا!“ اس نے کہا اور اٹھ کر دروازے پر گیا۔

”دروازے پر کون ہے؟“ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

”پولیس!“ ادھر سے جواب ملا، یہ جواب سنتے ہی شوقا نے خنجر اپنی پنڈلی

سے بندھی پٹی میں اڑس لیا اور غرا کر بولا:

”خبردار! پولیس کو کوئی غلط بیان نہ دینا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے

دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا، دروازہ کھلا اور ایک پولیس انسپکٹر چار کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں، وقت گزاری کے لیے تاش کھیل رہے ہیں۔“

اسی دوران وہ نوٹ بھی سمیٹ چکے تھے، اسی لیے شوقا نے خالی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ جملہ کہا:

”لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں جو اہور ہا تھا، ہم تم لوگوں کی تلاشی لیں گے، مسٹر شوقا اس بار بچ نہیں سکتے۔“ انسپکٹر نے جلدی جلدی کہا۔

”انسپکٹر فیروز! تم پہلے بھی کئی بار مجھے گرفتار کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہو، اس بار بھی یہی ہوگا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تم ہمیں پولیس اسٹیشن تک لے جا کر

ایک آدھ گھنٹے کے لیے حوالات میں بند کر دو گے، لیکن پھر ایس پی صاحب کا فون آئے گا اور تم حوالات کا دروازہ کھلوانے پر مجبور ہو جاؤ گے، لہذا ہمیں ہمارے حال پر

چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“ شوقا نے گستاخانہ انداز میں کہا۔

”تلاشی لیے بغیر نہیں جاؤں گا، دوسرے کمرے میں بھی شاید جو اہی ہو رہا ہے، شیر خال ادھر کیا حالات ہیں۔“ اس نے ذرا بلند آواز میں کسی سے پوچھا۔

”جناب! اس کمرے میں جو اکیلے کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے، البتہ یہاں دوڑ کے، ایک لڑکی اور ارسلان تیمور ضرور موجود ہیں۔“

”اوہ! ارسلان تیمور! اسے پکڑ کر ادھر لے آؤ، آج یہ بھی نہیں بچ سکتا۔“

چند سیکنڈ بعد ہی وہ تینوں اور ارسلان تیمور بھی اس کمرے میں کھڑے تھے، پھر کانسٹیبلوں نے سب کی تلاشی لی اور انسپکٹر جمشید اور شوقا وغیرہ کی جیبوں سے مڑے

ترے نوٹ برآمد کر لیے گئے۔

”اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ تم لوگ جو اکیلے رہے تھے، تم سب کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔“

”تم تو کہتے تھے، پولیس اس ہوٹل پر چھاپہ نہیں مار سکتی۔“ انسپکٹر جمشید نے

شوفا کو کھورا، اس نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش کھڑا انسپکٹر کو گھورتا رہا۔

”بڑے میاں تم کون ہو، یہاں کب آئے ہو، شوفا اور اس کے ساتھیوں کا تو کام ہی یہی ہے کہ یہاں آنے والوں کو گھیر لیتے ہیں، ان سے جوا کھیلنے ہیں اور ان کی جیبیں خالی کر دیتے ہیں، شاید تمہارے ساتھ بھی یہی ہوتا، اگر میں نہ آ جاتا۔“

”جی نہیں! میں نے آج انہیں بہت بُری ہار دی ہے، یہ سب مڑے تڑے نوٹ ان کی جیبوں سے نکلوا لیے تھے۔“

”تم نے نکلوا لیے تھے، کیا کہہ رہے ہو بڑے میاں، یہ تو اچھے اچھوں سے جیت لیتے ہیں اور پھر یہ نوٹ تو ان کی جیبوں سے نکلے ہیں، اگر تم نے جیت لیے تھے تو ان کی جیبوں میں کس طرح پہنچ گئے۔“ انسپکٹر فیروز نے حیران ہو کر کہا۔

”میں نے جوا بونٹی شغل کے طور پر شروع کر دیا تھا، ورنہ میں جوے میں جیتی ہوئی رقم کو حرام کی دولت خیال کرتا ہوں اور اس کی ایک پائی بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کر سکتا، اس لیے میں نے جیتی ہوئی رقم انہیں لوٹا دی تھی۔“

”تم عجیب آدمی ہو بڑے میاں۔“

”میں بڑے میاں نہیں، نواب عرفان علی ہوں، یہ میرے بچے سلمان علی،

رحمان علی اور شریا علی ہیں۔“

”اوہ! تو آپ نواب ہیں۔“ انسپکٹر فیروز کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں! اللہ کی مہربانی ہے۔“ انہوں نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”انسپکٹر صاحب! آپ نے ارسلان تیمور صاحب سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ

دوسرے کمرے میں کیا کر رہے تھے جب کہ ان کے ساتھی اس کمرے میں کھیل رہے

تھے۔“ اچانک محمود نے کہا اور انسپکٹر فیروز چونک اٹھا۔

”واقعی! یہ بات تو مجھے فوراً پوچھنی چاہیے تھی، ہاں تو ارسلان بتاؤ، تم اس

کمرے میں کیا کر رہے تھے۔“

”مم.... میں.... میں تو وہاں کچھ نہیں کر رہا تھا، بس آرام کر رہا تھا۔“

”کیا وہ کمرہ تمہارے نام ہے۔“ فاروق نے جل کر کہا۔

”نہیں، لیکن ہم اس ہوٹل کے مستقل گاہک ہیں، ہوٹل کے مالک سے

ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں، اس لیے جس خالی کمرے میں میں چاہیں آرام کر سکتے ہیں۔“

”خیر، اب انسپکٹر صاحب کو یہ بتا دو کہ وہاں کیا کر رہے تھے۔“ فرزانہ

بولی۔

”میں کہہ چکا ہوں، کچھ نہیں کر رہا تھا۔“

”ہم بتاتے ہیں۔“ محمود نے آگے بڑھ کر کہا اور پھر جلدی جلدی انسپکٹر

فیروز کو تفصیل بتادی۔

”اوہ! تو یہ بات ہے، یہ آج تک لوگوں کو اس طرح ٹھکتے ہیں، خیر اب یہ

میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتے.... لگاؤ انہیں ہتھکڑیاں۔“ اس نے کانٹیلوں سے

کہا، کانٹیل ان کی طرف بڑھے۔

”ہمارے ساتھ انہیں گرفتار کریں۔“ شوفا نے منہ بنایا۔

”کیوں، انہوں نے کیا کیا ہے، یہ تو جیتی ہوئی رقم بھی لوٹا چکے تھے، البتہ

نواب صاحب آپ کو ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن تک ضرور چلنا پڑے گا، تاکہ آپ

وہاں تحریری طور پر گواہی دے سکیں۔“

”ہم.... ہم ضرور چلیں گے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

ان کا جملہ سن کر فرزانہ نے انہیں بوکھلا کر دیکھا، جیسے کہنا چاہتی ہو، ابا جان

ہم جال میں پھنستے جا رہے ہیں، جال کا گھیرا ہر لمحے تنگ ہوتا جا رہا ہے، لیکن انسپکٹر

جشید تو اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہے تھے، وہ تو تھانے دار کی طرف متوجہ تھے۔
اور پھر وہ ایک ہی جیب میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔
”نواب صاحب! آپ پہلے بھی کبھی فرح آباد آئے ہیں۔“ انسپکٹر
صاحب نے جیب چلاتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں! پہلا اتفاق ہے۔“ وہ بولے۔

”سیر پائے کی غرض سے آئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی نہیں! صرف سیر کی غرض سے آئے تھے، پائے کے لیے پھر کبھی
آنے کا پروگرام تھا۔“ فاروق بول پڑا اور انسپکٹر فیروز نے گردن گھما کر اسے اس طرح
گھورا، جیسے وہ کوئی پاگل ہو۔

”اس کے دماغ کا نہیں، زبان کا پرزہ ڈھیلا ہے۔“ انسپکٹر جشید کی بجائے

محمود نے کہا۔

”میرا بھائی ٹھیک کہتا ہے انسپکٹر صاحب، دماغ کا پرزہ تو دراصل اس کا
ڈھیلا ہے۔“ فاروق مسکرایا اور انسپکٹر جشید اور فیروز انہ مسکرائے۔

”یہ قصبہ بہت غلط لوگوں سے بھرا پڑا ہے، آئے دن لوگوں کو لوٹ لیا جاتا
ہے، میں تو تنگ آ گیا ہوں یہاں سے۔“

”اگر آپ تنگ آ گئے ہیں تو اپنا تبادلہ کرائیں۔“ فاروق نے جلدی سے کہا
اور اس نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

”یہ پولیس اسٹیشن کتنی دور ہے، ابھی تک نہیں آیا۔“ انسپکٹر جشید بولے۔
”پولیس اسٹیشن تک جانے الی اصل سڑک آج کل ٹوٹی ہوئی ہے، اس لیے

ہمیں چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔“ انسپکٹر فیروز نے کہا۔
”اوہ! تو یہ بات ہے۔“ انسپکٹر جشید نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”ویسے یہ

مسٹر شوفا اور ان کے ساتھی آج تک گرفتار کیوں نہیں ہو سکے، کیا آپ بتا سکتے ہیں۔“
”یہ عام طور پر نوٹ عائب کر دیتے ہیں اور صاف بچ جاتے ہیں، لیکن
آج شاید انہیں موقع نہیں مل سکا۔“

اسی وقت جیب نے تیزی سے ایک موٹر گاڑا اور انہوں نے دیکھا، وہ اس
سڑک پر آچکے تھے، جس کے ذریعے دارالحکومت سے آئے تھے۔

”ارے! یہ سڑک تو دارالحکومت کو جاتی ہے۔“ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔
”ہاں! ہمیں تھوڑا آگے جا کر سیدھا جانے کی بجائے ایک موٹر اور مڑنا

ہے، اس کے بعد پولیس اسٹیشن ہمارے سامنے ہوگا۔“
فرزانہ نے فکر مند انداز سے انسپکٹر جشید کی طرف دیکھا، مگر وہ نواب بھی

ایسے انداز میں بیٹھے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اور پھر جیب نے موٹر گاڑا اور ایک تنگ سی سڑک پر اتر گئی، یہ کچی سڑک تھی،
دھول نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا، جیب نہ جانے کب تک اس سڑک پر چلتی

رہی اور پھر ایک جھٹکے سے رکی، انہوں نے چونک کر دیکھا، ان کے سامنے ایک بڑے
سے گیٹ پر لکھا نظر آیا۔

”پولیس اسٹیشن فرح آباد۔“

جیل میں

دروازے پر کھڑا کانٹیل ان کی جیب کو دیکھ کر انٹشن ہو گیا، وہ اندر پہنچے اور انسپکٹر فیروز اپنے دفتر کی کرسی پر بیٹھ گیا، معلوم ہوا، وہی پولیس اسٹیشن کا انچارج تھا، شوقا، ارسلان تیمور اور باقی دونوں ساتھی ہتھکڑیاں پہنے کانٹیلوں کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئے، ان سے پہلے ہی وہ چاروں اندر آ چکے تھے، وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے، کانٹیلوں نے شوقا اور اس کے ساتھیوں کو فرش پر بٹھا دیا۔

”پہلے میں آپ کے بیانات لوں گا، پھر ان کے خلاف پرچا کاٹ کر انہیں حوالات کی سیر کراؤں گا اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ کو رخصت کر دوں گا۔“ اچانک ایک سنسنائی آواز ان کے کانوں سے نکلنے لگی اور ساتھ ہی ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی، وہ تھرا اٹھے، فاروق نے کپکپاتی آواز میں کہا:

”یہ... یہ کیا تھا؟“

”شوقا جیسے یہاں نہ جانے کتنے آتے ہیں، انہیں سیدھا کرنے کے لیے کوڑے اور دوسری چیزیں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔“ انسپکٹر فیروز نے کہا۔

اچانک زور زور سے جوتے بجنے کی آواز سنائی دی، وہ سبھی چونک کر دروازے کی طرف مڑے اور پھر انسپکٹر سرفراز اور دوسرے کانٹیل بوکھلا اٹھے انسپکٹر سرفراز نے جلدی سے اٹھ کر اسے سلوٹ مارا۔

”آئیے سر!“ وہ بولا۔

”وقت بہت کم ہے سرفراز، تمہیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔“
”لیکن سر... شوقا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا آج بہت دنوں کی خواہش کے بعد موقع ملا ہے، ان حضرات کا بیان لینا بہت ضروری ہے۔“
”یہ کچھ دیر انتظار کر لیں گے، ہم ابھی واپس آ جائیں گے۔“ آنے والے آفیسر نے کہا۔

”بہت بہتر چوہان صاحب!“ یہ کہہ کر وہ ان کی طرف مڑا۔
”آپ لوگوں کو تکلیف تو ضرور ہوگی، لیکن ان مجرموں کے خلاف قانون کی مدد کرنا آپ کا فرض ہے۔“
”کوئی بات نہیں، ہم انتظار کر لیتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

”شکریہ یو اب صاحب۔“ انسپکٹر سرفراز نے کہا اور کانٹیلوں کی طرف مڑا۔
”تم انہیں حوالات میں بند کر دو، یہ شریف لوگ یہیں ٹھہریں گے۔“
”جی بہت اچھا۔“

اس کے ساتھ ہی انسپکٹر سرفراز چوہان نامی آفیسر کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا، پھر کانٹیل شوقا اور اس کے ساتھیوں کو لے کر دفتر سے نکل گئے، کمرے میں چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی، آخر فرزانہ سے رہا نہ گیا:

”ابا جان! آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہم تو ظفر الحسن اور اس کے دوست کی تلاش میں نکلے تھے، لیکن ان کا تو کہیں نام و نشان تک نہیں ملا اور ہم کسی اور ہی چکر میں پھنس گئے۔“

”میں نے سوچا، لگے ہاتھوں اس چکر سے بھی بٹ لیتے ہیں۔“ انسپکٹر

جمشید بولے۔

”کمرے میں فون موجود ہے، کیوں نہ اس دوران آپ انکل اکرام سے معلوم کر لیں، ہو سکتا ہے، فاران قیصر کا کوئی پتا چل گیا ہو۔“

”ہوں! ٹھیک ہے، اس طرح اکرام کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کہاں ہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر فون کا ریسیور اٹھا لیا، لیکن کان سے لگاتے ہی وہ ساکت رہ گئے اور پھر مایوس ہو کر ریسیور رکھ دیا۔

”کیوں ابا جان! کیا آپ نے ارادہ بدل دیا؟“ محمود نے جلدی سے

پوچھا۔

”نہیں! یہ ٹیلی فون صرف نمائش کے لیے رکھا ہے، ویسے یہ بالکل بے کار

ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”اوہ!“ ان کے منہ سے نکلا۔

”میں نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارے گرد جال بنا جا رہا ہے۔“

فرزانہ بولی۔

”یہ اندازہ میں لگا چکا تھا، لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا، یہ لوگ چاہتے کیا

ہیں.... ٹھہرو، میں اٹھ کر دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ کر ٹھیلنے کے انداز میں

دروازے پر آئے، باہر کا گیٹ انہیں بند نظر آیا، یہ لوہے کا تھا، انہوں نے ادھر ادھر

دیکھا.... دائیں بائیں کا جائزہ لیا، ادھر ادھر کے کمروں میں بھی کوئی نہ تھا، گیٹ کی

جھری میں سے باہر وہی تنگ سی سڑک نظر آئی، اس کا نشیمل کا بھی کہیں پتا نہ تھا جو انہیں

گیٹ پر کھڑا نظر آیا تھا، انہوں نے ہاتھ سے گیٹ کھولنے کی کوشش کی، لیکن معلوم ہوا،

وہ باہر سے بند تھا۔

شوفا اور اس کے ساتھیوں کو لے جانے والے کا نشیمل بھی کہیں نظر نہیں

آ رہے تھے، نہ جانے وہ حوالات کہاں تھے، وہ واپس ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

ان کی خاموشی نے تینوں کو بتا دیا کہ معاملہ کیا ہے، حالات کس حد تک خوف ناک ہیں، کمرے میں گہرا سناٹا طاری ہو گیا، بس ان کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

☆☆

”اب ہم یہاں کے قیدی ہیں۔“ آخر کافی دیر بعد انسپکٹر جمشید کے منہ سے

نکلا۔

”سوال یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں، اگر انسپکٹر فیروز اور کا نشیمل نقلی

پولیس والے تھے تو کیا ہوٹل انصار والوں کو یہ بات معلوم نہیں، آخر یہ لوگ ہمیں وہاں

سے ہی لے کر آئے ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے، ہوٹل انصار کے بھی کچھ لوگ ان کے ساتھ شامل

ہیں۔“ فاروق بولا۔

”ہاں! اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا

کریں۔“ فرزانہ بولی۔

”وہ لوٹ کر آئیں گے ہی، ان کے آنے پر ہی معلوم ہو سکے گا۔“ انسپکٹر

جمشید بولے۔

”معلوم ہوتا ہے، اس بار ہم بہت بُری طرح پھنس گئے ہیں۔“ فرزانہ

نے کہا۔

”بہت بُری طرح پھنسنے ہماری قسمت میں شروع سے ہی لکھ دیا گیا تھا، ہم

کری کیا سکتے ہیں۔“ فاروق نے مسکرت بنا کر کہا۔

”کم از کم ہمیں ادھر ادھر چل پھر کر جائزہ تو لینا چاہیے، ہو سکتا ہے، یہاں

سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر آ جائے۔“ محمود نے تجویز پیش کی۔

”میں دیکھ آیا ہوں، تم بھی اپنا شوق پورا کر لو، عام آدمی کے لیے اس جگہ سے نکلنا ناممکن ہے، ہمارے لیے کچھ مشکل ثابت نہیں ہوگا، لیکن ابھی تو ہمارا جانے کا پروگرام ہی نہیں ہے، جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں، یہ فرح آباد میں آنے والے دولت مندوں کے ساتھ کیا چکر چلاتے ہیں۔“

”دولت حاصل کرنے کے سوا ان کا اور کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔“

”تو کیا یہ لوگ ہمیں اس لیے لے آئے ہیں کہ آپ ایک نواب ہیں؟“

محمود نے پوچھا۔

”ہاں! اگر میں نے نوٹوں کی گڈیوں کی جھلک نہ دکھائی ہوتی تو شاید یہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔“

”اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ فاران قیصر اور اس کا دوست بھی ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے، کہ یہ لوگ اپنے شاکر کو لوٹنے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔“

”اگر چھوڑ دیں گے تو ان کا راز نہ کھل جائے گا اور انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”تو..... تو کیا..... فاران قیصر.....! فرزانہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زندہ بھی ہوں گے یا نہیں، یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ان لوگوں کے ہی ہاتھ لگے ہوں، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے واقعی انہیں اغوا کر لیا ہو اور اب وہ اس کے باپ سے لمبی چوڑی رقم کا مطالبہ کریں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”ہم اس بیچ کو بھول گئے، جس کے بارے میں انسپکٹر سرفراز نے کہا تھا

کہ اس پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، آواز سے تو یوں لگا جیسے یہ کام کہیں نزدیک ہی

کیا جا رہا تھا، لیکن اب یہاں ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔“

”حوالات کے کمرے کہیں بھی نظر نہیں آتے، شاید اس کے لیے راستہ باہر

سے جاتا ہے یا کوئی اور خفیہ راستہ ہوگا۔“

”ابا جان! ہمارے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ ہم اس وقت کہاں ہیں، انکل اکرام کو صرف اتنا معلوم ہے کہ ہم فرح آباد میں ہیں، اس طرح ہم اس وقت بالکل بے یار و مددگار ہیں، اگر خدا نخواستہ ہم پھنس گئے تو کیا ہوگا۔“ فرزانہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”اگر تم ڈر رہے ہو تو میں تمہیں ابھی یہاں سے نکال دیتا ہوں، تم بڑی

آسانی سے گھر پہنچ سکتے ہو۔“

”اور آپ یہیں رہیں گے۔“ محمود نے پوچھا۔

”ہاں! میں فاران قیصر اور اس کے دوست کے بغیر یہاں سے جانا پسند

نہیں کروں گا۔“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے، وہ دونوں ان کے ہاتھ لگے بھی تھے یا نہیں۔“

”اگر وہ یہاں نہیں ہیں، تب بھی میں انہیں تلاش کروں گا۔“ انسپکٹر

جمشید کے لہجے میں چٹکتی تھی۔

”تو پھر ہم بھی نہیں جائیں گے۔“

”تو پھر آؤ، حوالات کا راستہ تلاش کریں، حوالاتیوں سے ہی ہمیں کچھ

معلومات حاصل ہو سکیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“

تینوں اٹھے ہی تھے کہ چکر اکر گرے، گرتے گرتے انہوں نے انسپکٹر

جمشید کی طرف دیکھا، وہ بھی آگے کو جھکتے جا رہے تھے۔

انہیں ہوش آیا تو وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے اور چاروں ایک ہی کوٹھری میں بند تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں، یہ کیا ہوا۔
آخر فاروق نے کہا:

”ابا جان! اس کوٹھری سے نکلنا ممکن ہے یا ناممکن۔“

”دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن یہ ہوا کیا، ہم تو انسپکٹر فیروز کا انتظار کر رہے تھے اور آگئی کمرے میں گئیں۔“

”میرا خیال ہے، یہ کوئی نقلی جیل نہیں، بالکل اصلی ہے اور اس میں نہ جانے اور کتنی کوٹھریوں میں آدمی بند ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”اصلی جیل کا مطلب تو یہ ہے کہ انسپکٹر فیروز اصلی پولیس انسپکٹر ہے تو پھر ہم یہاں کس جرم میں گرفتار ہیں، اور یہ جیل میں ڈالنے کا کون سا طریقہ ہے کہ پہلے گواہی کے لیے لائے، پھر گیس کے ذریعے بے ہوش کیا اور سلاخوں کے پیچھے کوٹھری میں پہنچا دیا۔“

”اگر وہ اصلی انسپکٹر ہے تو اسے اپنے اس کارنامے پر افسوس ہوگا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

اسی وقت انہوں نے ایک درد بھری بلند آواز سنی۔

”خالو! مجھے یہاں سے نکال دو، میرا دم گھٹنا جا رہا ہے۔“

آواز میں تڑپ تھی..... بے قراری تھی! گھبراہٹ تھی، ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، پھر کسی کے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔

ارسلان تیمور

قدموں کی آواز ان کی کوٹھری کے قریب ہی کہیں ٹک گئی پھر کسی نے خوف ناک آواز میں کہا:

”کیا ہے، کیوں پتلا رہے ہو۔“

”مم... مجھے جان سے مار دو، خدا کے لیے، مجھے مار دو، میں اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتا۔“ وہی آواز پھر بھیک مانگتی معلوم ہوئی۔

”لو! اس کا غذ پر دستخط کر دو، تمہیں اس کوٹھری سے نکال کر کھلی فضا میں پہنچا دیا جائے گا۔“

”لاؤ! کب تک تم دستخط کراؤ گے، آخر کب یہاں سے نجات ملے گی۔“

”دستخط کر دو، تمہارے بارے میں جلد کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔“

آوازیں آتا بند ہو گئیں، پھر سلاخوں والے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اچانک ایک اور آدمی کی آواز آئی:

”نئے قیدیوں کو دفتر میں پیش کرو، فوراً۔“

”اچھا!“ اسی خوف ناک آواز والے نے کہا، پھر اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا:

”تم اس رئیس زادے کو پارک میں چھوڑ آؤ، وہاں اس کا دم نہیں گھٹے گا۔“

”اچھا استاد۔“

قدموں کی آواز ان کی طرف بڑھنے لگی، انہوں نے دیکھا، ایک سیاہ رنگ کا بہت لمبے قد کا آدمی سلاخوں والے دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اس کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے، جن کے ہاتھوں میں شین گنیں تھیں، لمبے آدمی نے جھک کر دروازہ کھولا اور طرزیہ لمبے میں بولا:

”نواب صاحب باہر تشریف لے آئیے۔“

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ انسپکٹر جمشید نے تحریراتی آواز میں کہا۔

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”ابا جان! جب آپ کو معلوم ہو جائے تو ہمیں بھی بتا دیجئے گا۔“ فاروق نے

کانپ کر کہا۔

”تم بھی ساتھ ہی چل رہے ہو نواب زادے۔“

”ارے باپ رے.... مجھے تو یہ کوئی جلا د معلوم ہوتا ہے، جیلوں میں جلا دوں

کے جلال کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔“

”چلو نکلو باہر، تمہاری تو ابھی سے پھونک نکلنے لگی۔“ لمبے آدمی نے کہا جسے استاد

کہہ کر پکارا گیا تھا۔

”تو عام طور پر یہاں کس وقت پھونک نکلتی۔“ فاروق نے سہم کر کہا۔

”بکواس نہ کرو اور باہر نکلو، یہاں نوابی نہیں چلے گی۔“

چاروں کوٹھری سے باہر آئے، انہوں نے دیکھا، ایک قطار میں کوٹھریوں کا

سلسلہ بہت دور تک چلا گیا تھا، یہ کسی طرح بھی نقلی جیل نہیں معلوم ہوتی تھی۔

وہ ان کے آگے آگے چلنے لگے، ہر کوٹھری میں انہیں ایک یا دو آدمی ضرور نظر

آئے، ان کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی، ڈاڑھیوں کے بال بے تحاشہ بڑھ گئے

تھے اور یوں لگتا تھا، جیسے کوئی بحری جہاز کسی غیر آباد جزیرے میں ڈوب گیا ہو اور زندہ بچ جانے والوں نے جزیرے میں پناہ لے لی ہو، ان پناہ لینے والوں کے حلیے میں اور ان لوگوں کے حلیوں میں کوئی فرق نہیں تھا، انہیں ان پر بے تحاشہ ترس آنے لگا اور وہ سوچنے لگے، آخر یہ لوگ کر کیا رہے ہیں، انہوں نے تو باقاعدہ جیل بنا رکھی ہے۔

تقریباً دس منٹ تک کھڑکیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک بڑے سے لوہے کے پھاٹک کے پاس پہنچ گئے اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا، استاد نے اس دروازے پر ہاتھ مارا تو وہ فوراً کھل گیا، دوسری طرف سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور استاد پر نظر پڑتے ہی پیچھے ہٹ گیا، استاد انہیں لے کر آگے بڑھا اور ایک کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گیا، شین گنوں والے بدستور ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا، ان کے سامنے بڑی سی میز کے دوسری طرف ایک شاندار کرسی پر ارسلان تیمور بیٹھا تھا۔

☆☆

چند لمحوں تک وہ انہیں اور اسے وہ دیکھتے رہے، پھر ارسلان نے کہا:

”میں نے کہا تھا نا، میری رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا ہے، یہی خون تمہیں

یہاں لایا ہے۔“

”اور تیموری خون ہی ہمیں یہاں سے واپس لے جانے پر مجبور ہو جائے گا،

چاہے ہمیں اس میں سے کشتی رکھ کر کیوں نہ جانا پڑے۔“ فاروق نے تھملا کر کہا۔

”یہاں سے واپسی.... ہاں واپسی ناممکن نہیں.... نواب صاحب، آپ کا

بینک بیلنس کتنا ہے.... چیک بک تو آپ کے ساتھ ہوگی۔“

”میں ایسی چیزیں ساتھ رکھا کرتا ہوں، بینک میں میرے پاس ہوں گے ستر

اسی لاکھ۔“

”بہت خوب! اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں تمہیں گھر جیسا آرام ملے، اچھے کھانے ملیں اور کوٹھری کی بجائے آرام دہ کمرہ بھی دیا جائے تو پانچ لاکھ روپے کے ایک چیک پر دستخط کر دو۔“

پانچ لاکھ روپے کے چیک پر۔“ انسپکٹر جمشید نے چلا پڑنے والے انداز میں کہا۔

”ہاں! صرف پانچ لاکھ۔“

”اور اگر ہم اپنے گھر جانا چاہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”تو ستر لاکھ روپے کے چیک پر دستخط کر دو، چیک کیش ہونے تک تمہیں یہاں رہنا پڑے گا، اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔“

”کیا تمہارے خیال میں، یہاں سے آزاد ہونے کے بعد ہم پولیس میں اپنے لٹنے کی رپورٹ درج نہیں کرائیں گے اور پولیس تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔“

”نہیں! اس لیے کہ تمہیں نہیں معلوم، بے ہوش ہونے کے بعد تم کہاں لائے جا چکے ہو، بے ہوش ہونے سے پہلے تم جس پولیس اسٹیشن میں بیٹھے تھے، اس کا یہاں سے فاصلہ کم از کم سات سو میل دور ہے، تم پورا ایک دن بے ہوش رہے ہو، جب کہ شاید تم ابھی یہی سمجھ رہے ہو کہ صرف تھوڑی دیر پہلے تم بے ہوش ہوئے تھے، لہذا سات سو میل دور پولیس ہمیں کہاں تلاش کرے گی۔“

”پولیس تمہیں ہوٹل انصار سے تو گرفتار کر ہی سکے گی، کیا تم وہاں دوبارہ نہیں جاؤ گے، آخر تم نے اپنے شکار پھانسنے کا اڈہ ہوٹل انصار کو ہی تو بنا رکھا ہے۔“

”ہم اپنا منصوبہ مکمل کر چکے ہیں، یہ منصوبہ پچاس کروڑ روپے کا تھا، اس وقت تک ہم انچاس کروڑ روپے کے برابر حاصل کر چکے ہیں، تم اور تین شکار اور باقی ہیں،

جن کے چیک ایک دو دن میں کیش ہو جائیں گے، اس کے بعد سب لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا، پھر ہم ہوٹل انصار کے آس پاس کبھی نظر نہیں آئیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں چیک لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن ستر لاکھ روپے کا ایک ہی چیک کیسے کیش ہو سکے گا۔“ انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

”سترہ سترہ لاکھ روپے کے دو چیک اور دو اٹھارہ اٹھارہ لاکھ کے لکھ دو۔“ ہم کیش کرائیں گے۔“

”اور اگر میں نہ لکھوں تو....؟“

”تو اس کوٹھری میں تم اور تمہارے بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے، تم نے ان لوگوں کے حلیے تو دیکھ ہی لیے ہوں گے جو کوٹھریوں میں بند ہیں، وہ ہر قیمت پر ان سے نکل جانا چاہتے ہیں، ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ کسی طرح ان کوٹھریوں سے نکل جائیں۔“ ارسلان نے کہا۔

”اور وہ تمہارے ساتھی مسٹر شوفا کہاں ہیں۔“

”اس کے ذمے دوسرا کام ہے، وہ اپنا کام کر رہا ہے۔“

”یعنی چیک کیش کرانا اس کا کام ہے۔“

”ہاں یہی سمجھ لو۔“

”کیا تم ہی اس منصوبے کے انچارج ہو؟“ انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

”نہیں! انچارج تو کوئی اور ہے، میں اس کا نام نہیں بتا سکتا، لیکن تم اتنے

سوالات کیوں پوچھ رہے ہو، ان سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“ ارسلان نے کہا۔

”بہت خوب! ہمیں سوچنے کی مہلت دو، ہم کل جواب دیں گے۔“ انسپکٹر

جمشید نے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن یاد رکھو، ہمارا پروگرام دس دن سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کا

نہیں ہے، لہذا کل تک پوری طرح سوچ لینا، اب یہاں کا پروگرام سن لو، تمام جیلوں کی مانند کل تمام لوگوں کی حاضری بولی جائے گی، پھر ان سے جیل کی صفائی کا کام لیا جائے گا، یہ کام تمہیں بھی کرنا ہوگا۔

”معلوم ہوتا ہے، تم دولت مند لوگوں سے بہت جلتے ہو۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے، ارسلان نے ان کی مسکراہٹ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر بولا: ”ہاں! مجھے دولت مندوں سے خدا واسطے کا ہیر ہے، میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، ارد گرد کاروں اور کوفٹیوں والے رہتے تھے، لیکن کبھی کسی کار والے نے اتنا نہ کیا کہ مجھے لفٹ ہی دے دیتا، کسی روز سکول تک ہی چھوڑ آتا، اس قسم کی اور بہت سی بدسلوکیاں کاروں اور کوفٹیوں والوں نے ہم سے کیں، ہمارے گروہ میں سب لوگ دولت مندوں کے ستائے ہوئے ہیں۔“

”لیکن ان کا کیا قصور، جنہوں نے تمہیں نہیں ستایا، لیکن تم نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔“

”ان کا قصور یہی ہے کہ وہ دولت مند ہیں۔“ ارسلان نے کندھے اچکائے۔
”یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ جیل تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی، جہاں تک ہمارا خیال ہے، جیل مصنوعی نہیں۔“ فاروق نے کہا اور انسپکٹر جمشید بے ساختہ مسکرا دیے، کیونکہ جیل ہاتھ لگانا کچھ کم مزے دار بات نہیں تھی، محمود اور فرزانہ کو بعد میں سمجھ آئی اور وہ بھی ہنسنے لگے۔

”نہیں کیوں رہے ہو، تمہارے تو رونے کے دن ہیں، جب واپس اپنے گھر پہنچو گے تو بھوکے پیٹ کے ہونگے ہو گے، کیونکہ ادھر ادھر جو کچھ تمہارے پاس بچا رہا ہے گا، اس سے دوسروں کا حساب کتاب صاف کرو گے۔“ ارسلان نے نراسام نہ بنا کر کہا۔
”تم اس کی فکر نہ کرنا، میرے پاس بہت زمین ہے.... نہ ہم بھوکے سوئیں

گے، نہ تنگے، خدا کی مہربانی ہے۔“

”خیر تم جاسکتے ہو، استاد انہیں اسی کوٹھری میں لے جاؤ اور اگر یہ کسی وقت چیکوں پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، تو انہیں میرے پاس لے آنا۔“

”تم نے بتایا نہیں، جیل کیسے مل گئی۔“

”اس وقت تم لوگ ملک کے جس حصے میں ہو، یہاں کبھی کوئی چھوٹی سی ہندو ریاست تھی، اس کا راجہ بہت ظالم تھا، یہ جیل اسی نے بنوائی تھی، وہ اپنے مخالفوں سے اس جیل کو بھر دیتا تھا۔“

”بہت خوب! تو اب تم اس راجہ کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔“ محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بکومت، استاد انہیں لے جاؤ، کہیں میں ان کے لیے کوئی سخت حکم نہ دے بیٹھوں، یہ لوگ بہت باتونی ہیں۔“

”ہم میں سے کم از کم ایک کے بارے میں ضرور یہ بات کہی جاسکتی ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”حیرت ہے، تم لوگ ذرا خوف زدہ نہیں ہو، جب کہ یہاں پھنس جانے والوں کا حال دیکھنے والا ہوتا ہے۔“ استاد نے چونک کر کہا۔

”کچھ لوگ ضرورت سے زیادہ بے خوف ہوتے ہیں، تم فکر نہ کرو استاد، دو چار دن کوٹھری میں رہیں گے تو ساری بے خوفی ہوا ہو جائے گی، خوف ان کے اوپر اس طرح سوار ہو جائے گا، کہ اتارے نہیں اترے گا۔“

”ہم اتار کر کریں گے بھی کیا۔“ فاروق اس طرح ہاتھ ہلا کر بولا جیسے کبھی اڑائی ہو۔

”اب میں انہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔“ ارسلان نے جھلا کر کہا۔

اور استاد نے انہیں واپس چلنے کا اشارہ کیا، جس وقت وہ دوبارہ کوششی میں آئے تو سورج غروب ہونے والا تھا اور جیل کے اندر ابھی سے اندھیرا ہونے لگا تھا۔
”کیوں بھائی استاد! یہاں رات کو روشنی کا بھی انتظام ہے یا نہیں۔“ فاروق نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو چیک چپ چاپ لکھ دیتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”چیک کا اتنا فضول استعمال نہ کرو۔“ فاروق نے نصیحت کرنے والے انداز میں کہا۔

”کیا کہا، میں سمجھا نہیں۔“
”تم کیسے استاد ہو کہ سمجھتے نہیں، حالانکہ استاد تو دوسروں کو سمجھایا کرتے ہیں۔“
فرزانہ بولی۔

”معلوم ہوتا ہے، ان پڑھ استاد ہیں۔“
”بکواس نہ کرو، ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“ استاد غرایا۔
”ارے ارے بھائی، ناراض کیوں ہوتے ہو، اب ہم کچھ نہیں بولیں گے ہاں۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”چلو اندر داخل ہو جاؤ۔“ استاد کا ایک شیمن گن والا ساتھی بولا۔
”اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے تالا لگنے کی آواز سنی، پھر استاد اور اس کے ساتھی چلے گئے۔

”کم از کم ایک بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے۔“ محمود نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”کس بات پر شکر ادا کیا ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔
”اس پر کم از کم ایک بات تو پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے، ورنہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اب شاید ہم کبھی کوئی بات یقین سے نہ کہہ سکیں۔“ فاروق کا انداز مذاق اڑانے والا تھا، محمود کا منہ بن گیا، یہ دیکھ کر فرزانہ جلدی سے بولی:

”جلدی بتاؤ محمود، وہ کیا بات ہے، فاروق کی بات پر نہ جاؤ اسے تو عادت ہے، وقت بے وقت، بات بے بات اپنی بے کار کی ٹانگ اڑاتا چلا جاتا ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا، میرا بھی بالکل یہی خیال ہے، خدا کا شکر ہے کہ فاروق کے بارے میں صرف میرا ہی خیال نہیں، تم بھی میری ہم خیال ہو۔“ محمود نے جلدی جلدی کہا اور انسپکٹر جمشید کی ہنسی نکل گئی۔

”بھئی فاروق، تمہاری تو اس وقت محمود نے خوب ٹانگ لی۔“
”جی نہیں تو....“ اس نے بوکھلا کر اپنی دونوں ٹانگوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر مطمئن ہو کر بولا:

”موجود تو ہیں دونوں ٹانگیں۔“
”تم نے بتایا نہیں محمود۔“ فرزانہ نے کہا۔
”بتائے گا کیا بے چارہ، کچھ بتانے کے لیے ہو تو بات بھی...“
”میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ...“ محمود کہنے جا رہا تھا کہ فرزانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”کہ فاروق کے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔“
”چلو کچھ تو بھرا ہوا ہے، تمہاری طرح بالکل خالی تو نہیں ہے۔“
”توبہ ہے، مجھے بات مکمل کرنے ہی نہیں دیتے.... ہاں تو میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ظفر الحسن اور اس کا دوست ضرور ان لوگوں کے ہی ہاتھ لگ چکے ہیں، ہوٹل میں

ان لوگوں نے غلط بات بتائی ہوگی کہ انہوں نے جو انہیں کھیلایا تھا۔“ آخر محمود نے کہا۔
 ”ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے، اس کا مطلب ہے، ہم وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں
 پہنچنے کا پروگرام تھا۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔
 ”خود کہاں پہنچے ہیں، پہنچا دیے گئے ہیں۔“ محمود بولا۔

”اور یہ بہت اچھا ہوا، یہاں تو نہ جانے کتنے مظلوم قید ہیں اور میں تمہیں یہ
 بتا دوں کہ منصوبہ مکمل کرنے کے بعد یہ کسی ایک کو بھی زندہ چھوڑیں گے، قیدیوں نے
 صرف اس امید پر چپک لکھ کر دیے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو جا سکیں گے.... لیکن یہ
 لوگ ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔“
 ”اوہ! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔
 آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

☆☆☆

بھوک کا بدلہ

رات کے وقت انہیں کھانے پینے کے لیے بالکل کچھ نہیں دیا گیا، جب سے وہ
 ہوٹل سے چلے تھے، ایک کھیل بھی اڑ کر ان کے منہ میں نہیں پہنچی تھی۔
 ”کیا یہ لوگ ہمیں بھوکا مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“
 ”ہاں! تاکہ ہم بھوک اور پیاس سے تنگ آ کر چپک لکھ دیں۔“
 ”تو لکھ دیں نا چپک، ہمارا کیا جاتا ہے۔“ فاروق نے گھبرا کر کہا۔
 ”معلوم ہوتا ہے، تمہیں بہت بھوک لگی ہے۔“ انسپکٹر جشید مسکرائے۔
 ”کوٹھری میں اندھیرا ہو چکا تھا، لیکن ان کے جملے میں ہنسی کی آواز بھی شامل
 تھی، لہذا وہ محسوس کر سکتے تھے کہ انہوں نے یہ جملہ مسکرا کر کہا۔
 ”کیا آپ کو بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔“

”نہیں! میں کم از کم دو دن تک بغیر کھائے پیے درست حالت میں رہ سکتا ہوں،
 اس کے بعد کمزوری محسوس ہونے لگے گی۔“ انہوں نے کہا۔
 ”لیکن ہم کیا کریں، ہمارا تو مارے بھوک کے دم نکلا جا رہا ہے۔“ فرزانہ
 بولی۔

”تمہاری بھوک کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گے، میرا خیال تھا کہ یہ لوگ
 کھانا دیں گے۔“

”ظہرو! میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے دروازے کی سلاخوں کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا، اس طرح بڑی بے ہنگم سی آواز پیدا ہوئی، اچانک کسی نے کہا۔

”یہ کون دیوانہ ہے.... چار دن بعد ذرا دیر کے لیے آنکھ لگی تھی کہ شور مچا دیا۔“

”اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

”واقعی نہ جانے ان لوگوں پر کیا بیت رہی ہے، خیر ہم کوئی دوسری ترکیب کرتے

ہیں۔“

ابھی انہوں نے دوسری ترکیب کے بارے میں غور بھی نہیں کیا تھا کہ استاد کی کھردری سی آواز سنائی دی:

”کیا بات ہے، تم کیوں شور مچا رہے ہو۔“

”کیا ہمیں کھانا نہیں ملے گا۔“

”کھانا صرف چیکوں پر دستخط کرنے والوں کو ملتا ہے۔“

”تو میں دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”لیکن اب وقت گزر چکا ہے، دستخط اب صبح ہی کرائے جائیں گے۔“

”تب پھر ہمیں کھانے کے لیے کچھ دو۔“ انہوں نے کہا۔

”کھانے کے لیے بھی صبح ہی ملے گا، ہو سکتا ہے، پیٹ بھرنے کے بعد تم پھر

دستخط کرنے سے انکار کر دو۔“

”عجیب بے وقوف ہو، جب میں کہہ رہا ہوں، دستخط ابھی کراؤ، تو پھر اس میں

کیا حرج ہے۔“ انسپکٹر جمشید جھلا کر بولے۔

”تم.... تم نے مجھے بے وقوف کہا۔“ استاد فرمایا۔ ”تمہیں اس کی سزا ملے گی۔“

”لیجئے.... کھانے کی بجائے سزا کھائیے۔“ فاروق نے جلتے جلتے لہجے میں

کہا۔

”اسی وقت انہوں نے تالا کھلنے کی آواز سنی۔“

”معلوم ہوتا ہے.... یہ ابھی سزا دینے کے موڈ میں ہے۔“ فرزانہ نے کانپ کر

کہا۔

”بھائی استاد.... کھانے کی طرح سزا کا پروگرام بھی صبح پر چھوڑ دو۔“ فاروق

رونی آواز میں بولا، وہ فکر مند تھے کہ اندھیرے میں نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

”یہاں میرا راج ہے اور سب قیدی میرے رحم و کرم پر ہیں، پھر کس کی مجال کہ

کوئی مجھے بے وقوف کہہ سکے۔“ اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

”صحن میں گھپ اندھیرا تھا، کوٹھڑی میں اس سے بھی زیادہ اندھیرا تھا، آج

آسمان پر تارے بھی نہیں نکلے تھے، استاد انہیں ایک لمبے سے سائے کی صورت میں نظر

آ رہا تھا، ادھر وہ بھی اسے مدھم مدھم سے نظر آ رہے تھے، اس سے پہلے کہ استاد اندر قدم

رکھتا، انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی:

”تم لوگ اندر ہی رہو گے، خبردار جو باہر نکلے۔“

اس کے ساتھ ہی استاد کا لمبا ہاتھ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا، اور اس نے انہیں

بازو سے پکڑ کر باہر تھمٹ لیا، پھر جیل کے تمام قیدیوں نے اس کی گونج دار آواز سنی۔“

”جیل کے قیدیو.... ایک قیدی نے مجھے بو وقوف کہا ہے، اب میں اس کی

درگت بناؤں گا، تم لوگ اس کی چٹخیں سنو گے، لیکن اگر کسی نے اس کے لیے رحم کی

بھیک مانگی تو اس کا بھی یہی حشر کروں گا۔“

محمود، فاروق اور فرزانہ کانپ کر رہ گئے، حالات نے اچانک ہی ایک نیا رخ

اختیار کر لیا تھا، اندھیرے میں ان کے والد اور استاد انہیں صرف دو سائے سے نظر

آ رہے تھے، انہیں نہیں معلوم تھا کہ استاد کون سا ہے اور انسپکٹر جمشید کون سے۔

اور پھر اچانک انہوں نے ایک سائے کا ہاتھ بلند ہو کر نیچے گرتے دیکھا، ان میں زور آزمائی ہونے لگی، ہاتھ اور سر تیزی سے چلنے لگے۔ شاید کبھی قیدی سبے سبے انداز میں سلاخوں سے لگے یہ خوفناک لڑائی دیکھ رہے تھے۔

اچانک محمود، فاروق اور فرزانہ نے اپنے والد کی آواز سنی۔

”ہائے مر!.... ارے ظالم یہ کیا کر رہا ہے، اُف خدا....“

وہ بے تاب ہو گئے، بے چین ہو گئے، محمود نے بوکھلا کر کہا:

”اب میں اندر نہیں رہ سکتا، میں ان کی مدد کے لیے جاؤں گا۔“

”لیکن ہمارے لیے ان کی ہدایت یہی ہے کہ ہم کوٹھری سے نہ نکلیں۔“ فرزانہ

بولی۔

”تو کیا ہم یہ سب کچھ بے بسی کے عالم میں دیکھتے رہیں.... یہ نہیں ہو سکتا۔“

فاروق نے کہا۔

”تم جانتے ہی ہو، جب بھی ہم نے ابا جان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا، ہمیں

پچھتانا پڑا۔“ فرزانہ نے کہا۔

”لیکن اس وقت حالات بالکل مختلف ہیں اور ہم یہ کسی طرح بھی برداشت نہیں

کر سکتے۔“ فاروق نے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔

”اگر تم یہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے پھر جاؤ، کم از کم میں تو ابا جان کی

ناراضگی مول نہیں لوں گی۔“ فرزانہ نے کہا۔

”تم بزدل ہو۔“ محمود نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں بزدل ہی بھلی، تم جا کر بہادری جتاؤ۔“

”تمہیں ابا جان کا ذرا بھی فکر نہیں۔“ فاروق نے تلملا کر کہا۔

”بے وقوف ہو تم دونوں! کیا تم سمجھتے ہو، ابا جان استاد جیسے آدمی کے مقابلے

میں مار کھا جائیں گے۔“ فرزانہ نے بھی جھلا کر کہا اور وہ دونوں چونک اٹھے۔

”لیکن ہم نے ان کی آواز سنی ہے۔“

”بے شک سنی ہے.... لیکن یہ ایکٹنگ بھی تو ہو سکتی ہے۔“ فرزانہ نے ہر سکون

لہجے میں کہا۔

”اوہ!“ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، اسی وقت انہوں نے ایک بار پھر

اپنے والد کو چہنچہنا سنا، وہ اس طرح چہنچہتے تھے، جیسے انہیں بہت زبردست چوٹ آئی ہو،

اس کے ساتھ ہی انہوں نے استاد کی گرج دار آواز سنی:

”میں تمہیں ایسا سبق دوں گا کہ کوئی قیدی پھر ایسی جرأت نہ کر سکے گا۔“

اور پھر انہوں نے انسپکٹر جمشید کے بلبلانے کی آواز سنی، محمود اور فاروق ایک بار

پھر بے تاب ہو کر دروازے سے باہر نکلتے گئے، لیکن فرزانہ نے انہیں پیچھے سے پکڑ

لیا۔

”تم پھر بے وقوف بن رہے ہو۔“

”اب تو ہم استاد کی آواز بھی سن چکے ہیں۔“ محمود نے بوکھلا کر کہا۔

”صبر سے کام لو، ورنہ شرمندگی ہوگی۔“

”ہوتی ہے تو ہونے دو۔“

عین اسی وقت انہوں نے کڑک کی آواز سنی اور ایک سائے کو کٹے ہوئے

رخت کی طرح گرتے دیکھا۔

”بس تمہارے لئے اتنی ہی سزا کافی ہے۔“ استاد کی آواز گونجی، انہوں نے

کھڑے ہوئے سائے کو گرنے والے سائے پر جھکتے اور پھر اسے کندھے پر اٹھاتے

دیکھا، اب وہ اسے کندھے پر اٹھائے ان کی کوٹھری کی طرف آرہا تھا۔

”خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔“ فرزانہ نے سرد آواز میں کہا۔

”تمہارا مطلب ہے، ہم استاد کو جانے دیں۔“ محمود نے برا سامنہ بتایا۔
 ”خاموش!“ فرزانہ سانپ کی طرح پھنکاری اور وہ دونوں دھک سے رہ گئے،
 اسی وقت دو میں سے ایک سایہ دھڑام سے ان کے پاس پھینک دیا گیا۔
 ”لو سنبھالو اسے۔“ انہوں نے استاد کی بلند آواز سنیں۔
 وہ سکتے کے عالم میں گرنے والے سائے پر جھکے اور پھر انہیں فوراً ہی یہ احساس
 ہو گیا کہ وہ انسپکٹر جمشید نہیں، استاد ہے، انسپکٹر جمشید تو ان کے سامنے کھڑے مسکرا رہے
 تھے۔

”دیکھا! اسی لیے میں دخل دینے کے مخالف تھی۔“ فرزانہ چپکی۔
 ”اس کے لباس کو ٹٹولو، چابیوں کا کچھا موجود ہوگا، بیٹھے بٹھائے ہی یہ ہو گیا،
 ابھی تو ہم نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے، ابھی کسی کو یہ معلوم نہیں کہ کیا ہو چکا
 ہے۔“
 ”آپ نے سوچا کیا ہے؟“ محمود نے پوچھا۔

”پہلے تو ان سب مظلوموں کو کوٹھریوں سے نکالیں گے اور پھر باہر نکلنے کا راستہ
 تلاش کریں گے، ارسلان تیمور اور اس کے کچھ ساتھی اگر یہاں موجود ہیں تو ان پر قابو
 پانا بہت ضروری ہے، لیکن اس سے پہلے استاد کو جکڑ دینا چاہیے، اگر چہ صبح سے پہلے
 ہوش میں نہیں آئے گا۔“

”چابیوں کا کچھا مل گیا، انسپکٹر جمشید وہ لے کر کوٹھریوں کو کھولنے چلے گئے، مجھ
 فاروق اور فرزانہ استاد کو رد مالوں اور بیٹوں سے باندھنے کی کوشش کرنے لگے۔
 ساتھ والی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ کر انسپکٹر جمشید اپنی آواز میں بولے:
 ”کیا تم سب لوگ اس جیل سے باہر نکلنا چاہتے ہو۔“

اندر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، شاید وہ سوچ رہے تھے کہ ان

کانوں نے دھوکا کھایا ہے، یا شاید انہوں نے خواب میں یہ جملہ سنا ہے، آخر ان میں
 سے ایک نے کہا:
 ”تم کون ہو؟“

”میں وہ ہوں جسے ابھی ابھی استاد نے مارنے پٹنے کے لیے کوٹھری سے باہر
 نکالا تھا، کیونکہ میں نے اسے بے وقوف کہہ دیا تھا۔“
 ”لیکن ابھی ابھی تو تم اس کے ہاتھ سے پٹ رہے تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ
 تم یہاں کھڑے ہو۔“

”پٹ میں نہیں، وہ رہا تھا میں نے اس کا منہ بند کر رکھا تھا اور خود پٹنے کی
 آوازیں منہ سے نکال رہا تھا، اب ہم نے اسے باندھ لیا ہے اور جکڑ دیا ہے، چابیوں کا
 کچھا اس وقت میرے ہاتھ میں ہے، اس لیے جلد فیصلہ کرو، آواز ہونا چاہتے ہو، یا
 یہیں ساری عمر سزا چاہتے ہو، کیونکہ یہ لوگ تم سے سب کچھ لوٹ لینے کے بعد بھی
 تمہیں آزاد ہرگز نہیں کریں گے۔“

”ہماری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہاں سے نکلنا ہے۔“ ایک اور آواز
 آئی۔

”بہت خوب! لیکن تم شور نہیں مچاؤ گے.... بالکل خاموش رہو گے۔
 ”آپ فکر نہ کریں۔“

انسپکٹر جمشید نے اندھیرے میں باری باری تالے کو چابیاں لگانا شروع کیں،
 آخر تالا کھل گیا، جونہی انہوں نے دروازہ کھولا... اندر موجود قیدی اس طرح باہر نکلے
 جیسے کسی نے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا ہو۔

”اب تمام کوٹھریوں کے قیدیوں کو ساری بات سمجھاؤ، جب وہ صورت حال سمجھ
 جائیں گے تو پھر شرباری باری تمام کے دروازے کھول دوں گا، یہ یاد رہے کہ اگر کسی

کے منہ سے ذرا بھی آواز نکلی تو شاید یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے۔“

”بہت اچھا! آپ فکر نہ کریں، ایسا ہی ہوگا۔“

انہیں کوٹھریوں کی طرف بھیج کر انسپکٹر جمشید واپس اپنی کوٹھری میں آئے۔

”کیا تم استاد صاحب کو باندھ چکے ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں! کسی نہ کسی طرح باندھ ہی لیا ہے۔“

”تو پھر باہر نکل آؤ، تاکہ میں اس کوٹھری کا دروازہ بند کر کے تالا

لگا دوں.... اسے بھی تو ذرا کوٹھری کا مزہ چکھنا چاہیے۔“

”بات تو ٹھیک ہے۔“ محمود نے خوش ہو کر کہا اور تینوں باہر آگئے، دروازہ بند کر

کے تالا لگا دیا گیا تھا۔

وہ باہر نکلے، یہاں خاموشی سے کام ہو رہا تھا، پیغام آگے بڑھ رہا تھا، قیدیوں

میں خوشی کی لہر دوڑتی جا رہی تھی، آخر پہلی کوٹھری والوں نے آکر بتایا:

”سب لوگ خوشی سے آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں، ان کے

لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ اس جہنم سے انہیں نجات مل رہی

ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، اگر کسی نے ہدایات پر عمل نہ کیا تو ذمے داری اسی پر ہوگی، ہو

سکتا ہے، اس طرح سب کے سب پھنس جائیں۔“ انہوں نے کہا۔

”ہم نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔“

انسپکٹر جمشید نے ایک ایک کر کے تمام کوٹھریوں کے دروازے کھول دیے، اگر وہ

پہلے ہی خاموش رہنے کی سختی سے ہدایت نہ کر دیتے تو وہ اس طرح اچھلتے کودتے کہ

پوری جیل کو سر پر اٹھا لیتے۔

انسپکٹر جمشید نے سب کو محن میں جمع کیا اور بیٹھ جانے کے لیے کہا، اندھیرے

میں انہوں نے اندازہ لگایا، یہ تمہیں کے قریب آدمی تھے، ظاہر ہے، سبھی دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

”کیا تم لوگوں میں سے کوئی ظفر الحسن کا بیٹا فاران قیصر بھی ہے۔“

”جی ہاں! میں یہاں موجود ہوں، آپ کون ہیں اور آپ کو کیسے معلوم ہے کہ

میں یہاں ہوں۔“ ایک مردہ سی آواز سنائی دی۔

”اور تمہارے ساتھ ہمارا دوست اختر عباس بھی موجود ہے۔“

”جی ہاں! یہ غریب بھی میرے ساتھ موجود ہے اور جیل کی تمام سختیاں میری

بجائے اس نے جھیلی ہیں، ورنہ میں تو اس وقت تک مر چکا ہوتا۔“

”یہ بات اپنے باپ کو ضرور بتا دینا۔“ انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں! میں جانتا ہوں، وہ میرے دوست کو اچھا نہیں سمجھتے، لیکن میرا

دوست کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔“

”تم سب لوگ یہیں ٹھہرو گے، ہم پوری جیل کا جائزہ لے کر آتے ہیں، دیکھنا

یہ ہے کہ استاد کے علاوہ یہاں کچھ اور لوگ بھی ہیں یا نہیں، اگر نہیں تو پھر ہم لمبی تان کر

سوئیں گے اور صبح ان کا یہیں انتظار کریں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”لیکن ہم صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں سے کیوں نہ نکل جائیں۔“ ایک نے

سوال کیا۔

”اگر یہ ممکن ہو تو میں تم سب کو باہر نکالنے میں دیر نہیں لگاؤں گا، لیکن اُمید کم

ہے، میرا خیال ہے، ہمیں صبح کا انتظار کرنا ہی ہوگا۔“

”آزادی کی اُمید میں ہم کئی صبحوں کا انتظار کر سکتے ہیں۔“ فاران قیصر کی آواز

سنائی دی۔

ان سب کو وہیں چھوڑ کر وہ اس راستے پر چل پڑے، جس کے ذریعے ارسلان

تیور کے کمرے تک پہنچے تھے، لوہے کے پھانک پر پہنچ کر انہوں نے چھوٹے دروازے پر دباؤ ڈالا، لیکن وہ بند تھا، ”میں دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور اگر کوئی دوسری طرف آیا تو اس سے استاد کی آواز میں بات کروں گا، اگر دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو گیا تو پھر ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا۔“

”جی بہت اچھا۔“

انسپکٹر جمشید نے پہلے آہستہ سے دستک دی، پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، آخر نوبت دھڑ دھڑانے پر آ گئی، لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

”اس کا مطلب ہے، ہمیں صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔“ ان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں! اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمیں بھوکے ہی رہنا ہوگا، ابا جان! آپ

کو یاد ہوگا، یہ سارا چکر بھوک سے شروع ہوا تھا۔“

”ہاں! لیکن اپنے معدوں کو ٹٹولو، کیا اب بھی تمہیں بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”جی کیا مطلب... معدوں کو ٹٹولیں۔“

”ہاں! محسوس کرو، بھوک لگی ہے یا نہیں۔“

تینوں ایک لمحے کے لیے محسوس کرنے لگے، آخر فرزانہ بولی:

”واقعی ابا جان! اس وقت بھوک غائب ہے۔“

”میرا بھی یہی حال ہے۔“ محمود نے کہا۔

”اور مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ زندگی میں کبھی بھوک لگی ہی نہیں، لیکن ایسا

کیوں ہے ابا جان۔“

”انسان کو اگر اچانک بے پناہ خوشی میسر آ جائے تو اس کی بھوک پیاس پر لگا کر

اڑ جاتی ہے، اس وقت ہم نے تیس چالیس آدمیوں کو ایک ایسے جہنم سے نکالا ہے، جس

سے نکلنے کی انہیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی، لہذا ہم خوش اور مطمئن ہو گئے، بس اسی خوشی نے ہی بھوک اڑا دی، خود میرا بھی یہی حال ہے، آؤ اب چلیں اور قیدیوں کو صورت حال بتائیں، ابھی صبح کی بھی تیاری کرنا ہے، صبح کا منظر بھی عجیب منظر ہوگا۔

☆☆☆

نئے قیدی

سورج کی پہلی کرن جیل کے صحن میں پڑی، تمام قیدی زمین پر گہری نیند سو رہے تھے، لیکن ان میں ایک قیدی ایسا بھی تھا جس نے ساری رات پلک تک نہیں چپکی تھی، یہ انسپکٹر جمشید تھے، انہوں نے سونا مناسب نہیں سمجھا تھا، کیا خبر کب ارسلان تیور یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی آجائے اور وہ سب سوتے میں دھریے جائیں، شاید بہت دنوں بعد آرام اور سکون کی نیند سوائے تھے۔

لیکن اب ان کا سونے رہنا غلط تھا، لہذا انہوں نے سب کو جگا دیا، قیدیوں نے انہیں بتایا تھا کہ صبح سویرے اندرونی گیٹ کا دروازہ کھلتا ہے اور استاد کے ساتھی اندر آتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں شین گنیں ہوتی ہیں اور اس کے بعد استاد تمام کوٹھریاں کھول دیتا ہے تاکہ قیدیوں کی گنتی ہو سکے اور ان سے جیل کی صفائی کا کام لیا جاسکے۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ فکر استاد کے ساتھیوں کی تھی، کیونکہ وہ شین گنیں لے کر آتے تھے، اس لیے انہوں نے سب کو واپس کوٹھریوں میں جانے کی ہدایت کر دی، البتہ دروازوں کو تالے نہ لگائے، پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کو لے کر لوہے کے گیٹ پر آئے۔۔۔۔۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی، یہاں آنے سے پہلے ایک احتیاطی تدابیر انہوں نے یہ کی تھی کہ استاد کے منہ میں رومال ٹھونس کر اوپر ایک قیدی کی قمیض پھاڑ کر باندھ دی تھی، تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے، یوں ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا تھا، دن

کی روشنی میں انہوں نے فاران قیصر اور فرزانہ کی سکیلی کے بھائی کو بھی دیکھا تھا، وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے، حالانکہ ابھی انہیں یہاں قید ہوئے دوسرا ہی دن تھا اور اس وقت انہوں نے سوچا تھا، یہ اچھا ہی ہوا کہ ان دونوں کو پھانس کر یہاں بند کر دیا گیا، ورنہ وہ یہاں تک کیسے پہنچ سکتے۔

”یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم چھپ سکیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔
 ”پھر کیا کیا جائے، اس طرح تو وہ ہمیں شین گنوں کی زد پر رکھ لیں گے۔“ محمود بولا۔

”لیکن ہم اس بازو کی اوٹ تو لے ہی سکتے ہیں، اگرچہ یہ زیادہ محفوظ نہیں ہوگی۔“ فاروق نے اس بازو کی طرف اشارہ کیا جو صحن کے دونوں طرف لگائی گئی تھی۔

”بات تو کچھ ٹھیک ہی ہے، ظاہر ہے، باہر سے آنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ اندر حالات اس قدر تبدیل ہو چکے ہوں گے، اس لیے وہ اوٹ کی طرح منہ اٹھائے آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور اس وقت ہم ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”کاش ہمارے پاس اس وقت کوئی ہتھیار ہوتا۔“ فرزانہ کے منہ سے نکلا۔
 ”گھر سے چلتے وقت ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ اس کیس میں بھی ہتھیاروں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ محمود بولا۔

”آئندہ ہم ایک لمحے کے لیے نہیں تو کم از کم آدھے لمحے کے لیے ضرور سوچ لیا کریں گے۔“ فاروق نے کہا۔

”لے دے کر میرے جوتے کی ایڑی میں چاقو ضرور ہے۔“
 ”اگرچہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ وہ ہمارے کسی کام آ سکتا ہے، پھر

بھی اسے نکالا ہی لو اور جلدی جلدی بازو کے پیچھے اس طرح چھپ جاؤ کہ دروازے کی طرف سے نظر نہ آسکو، تمہارے چھپنے کے بعد میں دیکھوں گا کہ تم اس مقصد میں کس حد تک کامیاب رہتے ہیں اور پھر میں بھی ڈبک جاؤں گا اور محمود اٹھ کر دیکھے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، اگرچہ وہ مکمل طور پر خود کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، تاہم اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے، بازو کے پیچھے ڈبک جانے کے بعد محمود نے اپنا چاقو نکال کر اپنے والد کو دے دیا، یہ چاقویوں تو چھوٹا تھا، لیکن تھا بہت ہی خاص قسم کا.... ہڈی کو بھی موم کی طرح کاٹتا چلاتا تھا.... انہوں نے اسے اپنے قریب ہی زمین پر رکھ لیا اور انتظار کرنے لگے۔

”ہماری ذرا سی غلطی.... ذرا سی چوک سارا کھیل بگاڑ سکتی ہے، اس وقت تمیں پینتیس جانیں بچانے کی ذمہ داری ہم پر آ پڑی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں ابا جان! ہم ہر ممکن احتیاط سے کام لیں گے۔“

”استاد کے ساتھیوں کے آنے کا وقت ہو گیا ہے.... اب خاموش ہو جاؤ۔“

انہوں نے دم سادہ لیے، ایک ایک پل گن گن کر گزارنے لگے، دل دھک دھک کر رہے تھے، اگر تمیں کے قریب آدمیوں کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو ان کے دل شاید اس بُری طرح نہ دھڑکتے، آخر خدا خدا کر کے اپنی دروازے کے دوسرے طرف تالے میں چابی کھونسنے کی آواز سنائی دی، انہوں نے اپنے سانس روک لیے، آنکھیں چھوٹے دروازے پر جم کر رہ گئیں۔

پھر اچانک دروازہ کھلا، سب سے پہلے ایک آدمی اندر آیا، اس کے ہاتھ میں شین گن تھی، پھر تین اور آئے، ان کے پاس بھی شین گنیں تھیں، شین گنیں چاروں کے کندھوں سے لٹک رہی تھیں، لیکن کسی بھی لمحے وہ انہیں اتار سکتے تھے۔

”ہمبو! تم جا کر استاد کو اٹھاؤ، صبح سویرے سونے کی عادت نہیں جاتی اس کی۔“

ان میں سے ایک نے کہا۔

”اچھا!“ ہمبو نے کہا اور ان سے آگے بڑھ آیا، یہ خطرناک بات تھی، اب وہ اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے، ان چاروں کا ایک ساتھ آگے بڑھا ضروری تھا، اسی صورت میں وہ ان پر حملہ آور ہو سکتے تھے، ایک لمحے کے لیے وہ چکر کر رہ گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے بنایا یا کام بگڑ چلا ہو، سارا کام خراب ہونے والا ہو۔

☆☆

ایسے میں انسپکٹر جمشید کو عجیب سوچھی، انہوں نے پاس پڑا، اینٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پیچھے رہ جانے والے تین آدمیوں پر اچھال دیا، ٹکڑا ایک کی پیشانی پر زور سے لگا۔ ”اوئے میں حرا۔“ اس کے منہ سے چیخ کے انداز میں نکلا۔

”کیا ہوا؟“ ہمبو بوکھلا کر مڑا۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا انسپکٹر جمشید کو انتظار تھا، انہوں نے چپے کی پھرتی سے ہمبو پر چھلانگ لگا دی، ساتھ ہی محمود، فاروق اور فرزانہ نے باقی تین کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہمبو انسپکٹر جمشید کا دھکا لگتے ہی منہ کے بل گرا، دوسرے ہی لمحے اس کی شین گن ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے تینوں ساتھی بُری طرح بوکھلا گئے اور اس بوکھلاہٹ کا فائدہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو پہنچا، جتنی دیر میں وہ شین گنیں سنبھالتے، وہ ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے، انہوں نے ایک ساتھ ہوا میں چھلانگ لگائی اور ان سے ٹکرا گئے، تینوں بُری طرح لڑکھڑائے اور محمود، فاروق اور فرزانہ نے ان کی شین گنوں پر ہاتھ ڈال دیے، یہ سب کچھ آنا فانا میں ہو گیا، شین گنوں پر ان کے ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے نہیں تھے، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ تینوں ان کے ہاتھوں کی بجائے محمود، فاروق اور فرزانہ کے قبضے میں آ گئیں، تینوں اپنے والد کے ساتھ ہرگز چھلانگیں نہ لگائے، انسپکٹر

جشید تنہا بھی اس صورت حال نہٹ سکتے تھے، ہمو کی شین گن چھین کر وہ باقی تین پر فائرنگ کر دیتے، لیکن اس طرح گولیوں کی آواز لوہے کے گیٹ کے دوسری طرف پہنچ جاتی اور پروگرام درہم برہم ہو جاتا، وہ قیدی کے قیدی رہ جاتے اور کسی تدبیر سے جیل سے نکلنے بھی تو دشمن ہوشیار ہو چکے ہوتے، اس لیے محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی ایک ساتھ حرکت میں آنا پڑا اور اب وہ چاروں ہاتھ اوپر اٹھائے دہشت زدہ انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے، شاید ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہو کیا یا ہے، استاد کہاں ہے اور یہ لوگ کوٹھری سے باہر کیسے نکل آئے۔

”تم لوگ زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالو گے، ورنہ جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔“ انسپکٹر جشید سرگوشی کے انداز میں غرائے اور انہیں کوٹھریوں کی طرف چلنے کا اشارہ کیا، اپنی کوٹھری کے پاس لا کر انہوں نے دس قیدیوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور انہیں باندھنے لینے کا حکم دیا۔

چند منٹ بعد ان چاروں کو باندھ کر ان کے استاد کے ساتھ لٹا دیا گیا اور دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا گیا، ان میں سے دس قیدی انسپکٹر جشید کی ہدایت کے مطابق دروازے پر بھی پہرے دار بن کر کھڑے ہو گئے۔

اب انسپکٹر جشید ایک بار پھر لوہے کے گیٹ کی طرف چل پڑے، شین گنیں اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے چھوٹے دروازے پر دستک دی، دروازہ فوراً ہی کھلا اور پہرے دار نے سران کی طرف نکالا، پھر اس سے پہلے کہ وہ خوف زدہ انداز میں سر پیچھے ہٹا تا، انسپکٹر جشید نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ایک زبردست جھٹکا دیا، اور وہ اس طرح اوندھے منہ ان کی طرف آیا جیسے پانی میں تیر رہا ہو، محمود، فاروق اور فرزانہ نے فوراً اس پر قابو پالیا، منہ پر پہلے ہی انسپکٹر جشید ہاتھ جما چکے تھے، بس ایک ہلکی سی کراہ اس کے منہ سے نکل سکی، انسپکٹر جشید نے اس کی

دونوں کن پٹیاں مسل دیں، دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو چکا تھا، دس منٹ سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ناممکن تھا، اس لیے انہوں نے اسے اسی وقت کوٹھریوں تک لے جانے کی ضرورت نہ سمجھی اور بے دھڑک چھوٹے دروازے سے ہوتے دوسری طرف نکل آئے، ان کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا، جس میں بائیں ہاتھ ایک کمرے کا دروازہ نظر آیا، اس پر چمک پڑی تھی، سامنے ایک اور لوہے کا گیٹ تھا، اس میں ایک چھوٹا دروازہ تھا، اس دروازے کے باہر کوئی تھا یا نہیں، یہ انہیں معلوم نہیں تھا، لیکن پہلے انہوں نے اس کمرے میں داخل ہونا مناسب سمجھا، سب سے پہلے انسپکٹر جشید آواز پیدا کیے بغیر چمک اٹھا کر اندر داخل ہوئے، ان کے پیچھے تینوں بھی اندر در آئے۔

سامنے ایک میز چھٹی تھی، میزے کے دوسری طرف کرسی پر ایک آدمی سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا، اس کے سامنے میز پر بہت سی چمک بکلیں پڑی تھیں، چاروں اس طرح اندر داخل ہوئے تھے کہ ابھی تک اسے پتا نہیں چلا تھا، چاروں خاموشی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے، انہوں نے دیکھا، وہ ارسلان تیمور ہی تھا، آخر انسپکٹر جشید کو کھنکار کر اپنی موجودگی سے باخبر کرنا پڑا۔ ارسلان تیمور نے بے خیالی میں سر اوپر اٹھائے بغیر کہا:

”کیا بات ہے داؤد خاں۔“

”داؤد خاں شاید اس پہرے دار کا نام تھا جسے وہ دروازے کے دوسری طرف بے ہوش کر کے چھوڑ آئے تھے۔“

”یہاں کوئی داؤد خاں نہیں ہے، البتہ وہ دروازے کے دوسری طرف بے ہوش ضرور ہوا ہے۔“

ارسلان تیمور بھڑک کر کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھٹ

پڑیں، جسم میں تھر تھری دوڑ گئی، پھر اس کے منہ سے نکلا:

”تت..... تت..... تم..... تم۔“

”ہاں! ہم!“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”تم باہر کیسے نکلے۔“ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

”کالے علم کے ذریعے.... استاد کو بھی ہم نے کالے علم کے ذریعے کبھی بنا کر کوٹھری کی دیوار سے چکا دیا ہے اور اس کے چاروں ساتھیوں کو توالوں میں تبدیل کر کے ہوا میں اڑانے کی کوشش کی تھی، لیکن انہوں نے اڑنے سے انکار کر دیا، کیونکہ ان کا وقت تھا اور ان کے وقت آلو دیکھ نہیں سکتے، اب تمہاری باری ہے، ابا جان! میری درخواست ہے کہ اسے مرغا بنایا جائے، تاکہ ہم سکول کے زمانے کی یاد تازہ کر سکیں، ویسے تو یہ یاد انکل خان رحمان کے گھر تازہ ہوتی ہی رہتی ہے.... بیچارے ظہور کو کان پکڑے دیکھ کر۔“ فاروق شوخ انداز میں کہتا چلا گیا۔

”اتنی لمبی چوڑی تقریر کرنے کے لیے کس نے کہا تھا۔“ فرزانہ نے بڑا سامنہ بنایا۔

”کسی نے بھی نہیں، بس موڈ کی بات ہے۔“ فاروق بولا۔

”اور اب مسٹر ارسلان تیمور... تمہارا منصوبہ فیل ہو گیا ہے، ایک کروڑ روپے کی رقم کے خواب اب تم اصل جیل میں ہی دیکھنا۔“ محمود بولا۔

”ہاں! انہوں نے لوگوں کو نقلی جیل کی سیر کرائی، ہم انہیں اصلی جیل کی ہوا کھلائیں گے۔“

”کھڑے ہو جاؤ ارسلان تیمور! ہم جانتے ہیں تمہاری رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا ہے، لیکن کیا کیا جائے، قانون سب کے لیے برابر ہے۔“ انسپکٹر جمشید سخت لہجے میں بولے۔

”ارسلان کھڑا ہو گیا، اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی، اس کے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھ گئے، کیونکہ چار شیٹیں گیس اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”محمود! ان تمام چیک بکوں پر قبضہ کر لو، اس کمرے کی الماریوں میں جس قدر دولت موجود ہے، سب نکال لو، یہاں کسی کمرے میں تھیلے ضرور ہوں گے، آخر یہ تھیلوں میں ڈال کر ہی دولت لے جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہوں گے۔“

ان کے خیال کے مطابق پکڑے کے بڑے بڑے تھیلے ایک الماری میں مل گئے اور مزے کی بات یہ کہ نوٹوں کی گڈیاں ان میں پہلے ہی ٹھونس دی گئی تھیں، شاید وہ جانے کی تیاری مکمل کر چکے تھے، بس چند ایک چیک اور کیش کرانے باقی رہے ہوں گے۔“

تھیلے اٹھائے ارسلان تیمور اور پہرے دار کو اپنے آگے چلاتے وہ کوٹھریوں کے پاس آئے، اسے بھی استاد اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

ان لوگوں نے تمہیں مارا پٹا تو نہیں تھا۔“ انسپکٹر جمشید نے قیدیوں سے سوال کیا۔

”جب یہ صفائی کراتے تھے، اس وقت مارتے پینتے بھی تھے۔“ ایک قیدی نے بتایا۔

”تم یہاں کب سے ہو؟“ انسپکٹر جمشید نے اس سے پوچھا۔

”تقریباً ایک ماہ ہو چلا ہے۔“

”ہوں! میں تم سب کو اپنا اپنا بدلہ لینے کی اجازت دیتا ہوں، انہیں مارو... لیکن خیال رہے، ان میں سے کوئی جان سے نہ مر جائے۔“

اس اجازت کا ملنا تھا کہ قیدی آپے سے باہر ہو گئے، انہوں نے ارسلان تیمور اور اس کے ساتھیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالا اور لالتوں، مکوں اور تھپڑوں سے ان

کی خاطر تواضع شروع کر دی۔

انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ اس منظر کو ننھے ننھے بچوں کی طرف دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے، انہیں بے پناہ خوشی کا احساس ہو رہا تھا، ایسے میں انہیں یاد آیا کہ ابھی انہوں نے بیرونی پھاٹک کے باہر اطمینان نہیں کیا، کیا خبر وہاں بھی کوئی موجود ہو، یہ خیال آتے ہی انہوں نے ہاتھ اٹھا کر قیدیوں کو زکے کا اشارہ کیا اور سب کو نئے قیدیوں سمیت گیٹ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

بیرونی گیٹ پر آ کر انہوں نے سب کو دائیں بائیں دیوار سے لگ کر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود چھوٹے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔

☆☆☆

فاروق کا قہقہہ

یہ دیکھ کر ان سب کی جان میں جان آئی کہ باہر کوئی نہ تھا اور ایک کچی سڑک دور تک چلی گئی تھی، انسپکٹر جمشید ارسلان تیور کی طرف مڑے، اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حال بہت پتا تھا۔

”یہ سڑک کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے، کہیں ہم اسی سڑک سے تو یہاں نہیں آئے تھے، ہو سکتا ہے، اس جیل کے دوسری طرف وہ پولیس اسٹیشن ہو جس میں ہمیں بٹھایا گیا تھا، کیوں ٹھیک ہے نا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”نہیں! وہ پولیس اسٹیشن ایک اور جگہ بنایا گیا ہے۔“ ارسلان نے جواب دیا۔
 ”پھر بھی ہم فرح آباد سے سات سو میل تو دور ہرگز نہیں ہیں۔“ وہ بولے۔
 ”ہاں! یہ ٹھیک ہے، ہم فرح آباد سے صرف پانچ میل دور ہیں اور یہ ایک بالکل غیر آباد علاقہ ہے، دراصل یہ کلرزدہ زمین ہے، شاید اسی لیے یہاں لوگ آباد نہیں ہوئے۔“

”لیکن تم نے اسے آباد کر دیا۔“ انسپکٹر جمشید نے زہریلے لہجے میں بولے۔ ”جی تو چاہتا ہے، ان کوٹھریوں میں ہی تمہیں بند کر کے چھوڑ جائیں، لیکن یہ قانون کے خلاف ہے، تمہیں عدالت میں پیش کر کے سزا دلانا ہی انصاف ہے اور میں ایسا ہی کروں گا، اب یہ بتاؤ، اس سارے منصوبے کا انچارج کون ہے، تم، شوقا یا انسپکٹر

فیروز۔

”کم از کم انچارج میں نہیں، میں تو شوقا کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شوقا اس وقت کہاں ملے گا، وہ یہاں کب آتا ہے۔“

”یہاں وہ ہفتے میں ایک بار آتا ہے، کل آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر اس وقت وہ کہاں ہوگا۔“

”شاید ہوٹل انصار میں ہی ملے گا۔“

”بہت خوب! اب مسئلہ ہے، سب لوگوں کو شہر تک لے جانے کا، وہ جیپ کہاں ہے، جس میں ہمیں لا کر لایا گیا تھا۔“

”وہ شوقا ساتھ ہی واپس لے جاتا ہے۔“

”تم کیسے آتے ہو؟“

”موٹر سائیکل پر۔“

”چلو کچھ تو ہوا، میں یہاں سے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شہر جاؤں گا اور تین چار

گاڑیوں کا بندوبست کر کے لوٹوں گا، اس دوران تم سب نے قیدیوں کا پوری طرح

دھیان رکھو گے، محمود، فاروق اور فرزانہ تم تینوں بھی سہیں رہو گے، ایسا نہ ہو، یہ لوگ

کوئی شرارت کر جائیں۔“

”جی بہت بہتر! انہیں باندھ کیوں نہ دیں۔“ محمود نے کہا۔

”یہ اور بھی اچھا ہے گا۔“

”ابا جان! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، کیا آپ بھی اس گیس سے بے ہوش

ہو گئے تھے۔“

”ہاں! شاید اس وقت میں اونگھ گیا تھا جب گیس چھوڑی گئی، اسی لیے بے ہوش

ہو گیا، ورنہ مجھے معلوم ہوتا کہ ہم فرح آباد سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”تو پھر آپ جائیے، ہم یہاں آپ کا انتظار کریں گے۔“

”ابھی اس گیس کے دو مجرم آزاد ہیں، اگر ان لوگوں کی فکر نہ ہوتی تو پہلے میں

ان کی طرف توجہ دیتا۔“

”آپ ہماری فکر نہ کریں اور اپنا کام کریں۔“ فاروق نے کہا۔

انہوں نے ارسلان سے اس جگہ کے بارے میں معلوم کیا، جہاں موٹر سائیکل

رکھی گئی تھی اور پھر جھاڑیوں میں سے موٹر سائیکل نکال کر روانہ ہو گئے۔

”میں سمجھتا ہوں، ہم سب کو اندر ہی چل کر بیٹھنا چاہیے۔“ ان کے جانے کے

بعد محمود نے کہا۔

”ظاہر ہے، ہم اس کچی سڑک پر تو بیٹھ نہیں سکیں گے۔“ فاروق نے منہ

بتایا۔ ”تم نہ بھی سمجھو تب بھی ہم اندر ہی بیٹھیں گے۔“

”شکر ہے تمہاری بھی زبان چلی، میں سوچ رہا تھا، کہیں آج ہائیں کرنا بھول تو

نہیں گئے۔“ فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

”میری تو دونوں طرح مصیبت ہے، بولتا ہوں تب مصیبت، نہ بولوں تب

مصیبت۔“

”ایک تیسرا راستہ بھی ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”اچھا! وہ کیا۔“

”کم بولنا اور ہر وقت ادھر ادھر کی نہ ہانگے جانا۔“

”اب میں ادھر ادھر کی نہیں ہانگوں گا تو کیا اوپر نیچے کی ہانگوں گا۔“

”اچھا بس، پہلے ہم اندر جائیں گے، اپنے قیدیوں کو باندھیں گے اور پھر بیٹھ کر

تمہاری ادھر ادھر کی سنیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے ان سب کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

عین اسی وقت تین قار ہوئے اور تین گئیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔
وہ سب بُری طرح اچھلے، مڑ کر دیکھا تو درختوں کی اوٹ سے شوقا، انسپکٹر فیروز
اور دو اور آدمی نکل کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”ہم عین اس وقت یہاں پہنچے تھے جب تم لوگ گیٹ کھول کر باہر نکل رہے
تھے، دور سے ہی ہم نے یہ منظر دیکھ لیا اور چھپ گئے، ارسلان نے تم سے غلط کہا تھا،
ہمیں آج یہاں آنا تھا، نواب عرفان کی طرف سے ہم پہلے ہی فکر مند تھے، کیونکہ وہ
ضرورت سے زیادہ چالاک لگا تھا۔“ انسپکٹر فیروز طنز یہ لہجہ میں کہتا چلا گیا۔

”تو اس سارے منصوبے کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔“ محمود نے جلتے جھنے انداز
میں کہا۔

”مہم کا انچارج بے شک میں ہی ہوں، لیکن دماغ کسی اور کا کام کر رہا ہے، وہ
اس قسم کے منصوبے بنانے میں ماہر ہے۔“ انسپکٹر فیروز بولا۔
”کیا نام ہے اس کا؟“ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

”تم اس کا نام جان کر کیا کرو گے، تمہارے والد جب یہاں واپس آئیں گے تو
ہم یہاں سے جا چکے ہوں، اس ملک کی سرحد پار کر چکے ہوں گے۔“ اس نے کہا۔
”گو یا تمام انتظامات پہلے ہی کر لیے گئے ہیں۔“

”انتظامات تو چند روز بعد جانے کے کیے گئے تھے، لیکن اب چونکہ جیل کا راز
کھل گیا ہے، اس لیے ابھی اور اسی وقت جانا ہوگا، چلو اندر کوٹھریوں کی طرف، ایک
بار پھر تمہیں ان میں آرام کرنا پڑے گا اور یہ آرام ابدی ہوگا، اس کے بعد جب تمہاری
آنکھ کھلے گی تو قیامت کا دن ہوگا اور یہ دنیا درہم برہم ہو چکی ہوگی۔“ انسپکٹر فیروز نے
غریب انداز میں کہا۔

”اگر تم قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو تو یہ سب کچھ کس طرح کر سکتے ہو، کیا

تم اس روز خدا کے سامنے حاضر نہیں ہو گے۔“

”میں یقین نہیں رکھتا۔“ اس نے سر کو جھکا دیا، باتیں بند، اب اندر چلو۔“

وہ ایک بار پھر لوہے کے پھانک سے اندر داخل ہوئے، ان کے دل بیٹھے
جار ہے تھے، ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا تھا، حاصل ہونے والی آزادی کس قدر کم
مدت کی تھی، تیس کے تیس قیدیوں کے چہرے ایک دم یوں مرجھا گئے تھے، جیسے اب
کبھی ان پر مسکراہٹ نہ آئے گی، ان میں خود کو سنبھالے ہوئے اگر کوئی تھے تو محمود،
قاروق اور فرزانہ۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی... جب تم اپنے شکاروں کو یہاں لا کر ان کا سب
کچھ لوٹ لیتے رہے ہو تو ہوٹل انصار میں جوئے میں بے ایمانی کرنے کیا ضرورت
ہے۔“ محمود نے دوسرے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ برابر کسی موقع کی
تلاش میں تھا، لیکن انسپکٹر فیروز اور اس کے ساتھی بالکل چوکس تھے۔

”جوا کھیلنے ہوئے ہم یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اسامی کتنی موٹی ہے، اگر وہ کوئی
زیادہ مال دار آدمی نہیں ہوتا تو اس سے صرف جوئے میں نقد رقم ہتھیا لیتے ہیں، لیکن
موٹی اسامیوں کو گھیر کر اس جیل میں لے آتے ہیں۔“

”اور جوا سامیاں جوا کھیلنے پر تیار نہیں ہوتیں، ان کے ساتھ کیا کرتے ہو۔“

”وہ جب یہاں سے روانہ ہوتے ہیں تو ہم ان سے پہلے دارالحکومت جانے
والی سڑک پر پہنچ جاتے ہیں، میں گاڑی کو روک لیتا اور الزام عائد کر دیتا ہوں کہ گاڑی
مقررہ رفتار سے زیادہ تیز چلائی جا رہی ہے، لہذا ان لوگوں کو پولیس اسٹیشن تک چلنا
ہوگا، مسٹر فاران قیصر کو اسی طرح گھیرا گیا تھا، کیونکہ یہ جوائنٹس کھیلنے... شاید یہ کھیلنے پر
تیار ہو بھی جاتے مگر ان کے دوست نے انہیں سختی سے روک لیا تھا.... ایسے اچھے
دوست بہت کم ملتے ہیں۔“

”بہت خوب! اب یہ بھی بتادو، یہ منصوبہ کس نے بنایا تھا، کیونکہ ہم تو یہیں ختم ہو جائیں گے۔“

”پہلے ختم ہو جاؤ، پھر بتا دوں گا۔“ انسپکٹر فیروز نے مسکرا کر کہا۔

اب وہ اندر والا دروازہ بھی عبور کر آئے تھے اور کوٹریوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے، محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

”اگر ہم نے اس وقت بھی کچھ نہ کیا تو پھر کبھی کچھ نہ کر سکیں گے۔“

”تم سب لوگ اس بازو کے ساتھ ساتھ ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ، ہم تمہیں جنگی قیدیوں کی طرح گولی ماریں گے۔“ شوفا پہلی مرتبہ بولا۔

”تم لوگوں کو ہمیں مار کر کیا ملے گا، تم نے دولت حاصل کرنے کے لیے یہ منصوبہ بنایا تھا، سو وہ تم کر رہی چکے ہو، دولت لے کر تم ملک سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہو، پھر ہمیں کس لیے مارنا چاہتے ہو۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”ہم چاہتے ہیں، ہمارے خلاف گواہی دینے والا، ہماری شناخت کرنے والا اس دنیا میں کوئی نہ رہے۔“ انسپکٹر فیروز نے کہا۔

”تب تم بھول رہے ہو، ہمارے ابا جان یہاں موجود نہیں ہیں، تمہاری شناخت کرنے کے لیے وہ رہ جائیں گے۔“

”فکر نہ کرو، تمہیں ختم کرنے کے بعد ہم ان کا بھی انتظار کریں گے۔“

”بکواس! وہ اپنے ساتھ مدد لینے گئے ہیں، تم ان سب کیساتھ مقابلہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”ہم ان درختوں پر چڑھ جائیں گے اور شاخوں میں چھپ کر جب فائرنگ کریں گے تو سب کے سب آنے والے لے لیٹ جائیں گے۔“

وہ سکتے میں رہ گئے، انسپکٹر فیروز ٹھیک کہہ رہا تھا، اسی وقت محمود نے پوچھا:

”کیا تم اصلی انسپکٹر ہو، یا یہ سب بہروپ بھر رکھا ہے۔“

”ہاں! میں پولیس میں واقعی انسپکٹر ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تب تو تمہاری شناخت کرنے والے نہ جانے اور کتنے نکل آئیں گے۔“ محمود نے سوال کیا اور انسپکٹر فیروز نے اسے ٹیز ہی نظروں سے گھورا۔

”تم بہت چالاک ہو، خیر بتاتا ہوں، دراصل ہمارا ملک سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں، اپنا اپنا کام بدستور کرتے رہیں گے، چند سال تک نہایت ایمان داری سے اپنی ذیوقی انجام دینے کے بعد استعفیٰ دے دیں گے، پھر اس دولت سے عیش کریں گے، جو ایک بار پھر ہمارے قبضے میں ہے اور اب یہ سوال اور جواب ختم، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے.... لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔“

شین گنوں کا زخ ان کی طرف ہو گیا، ان کے دل زور سے دھڑکے، تیس آدمی تھر تھر کاہنے لگے، کسی آن میں فائرنگ شروع ہونے والی تھی اور وہ زمین پر اپنے ہی خون میں تڑپتے نظر آئے، اس لمحے محمود، فاروق اور فرزانہ نے خود کو بے بس محسوس کیا، لرزتے کانپتے قیدی ایک لائن میں کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگے، لیکن لڑکھڑا گئے اور ایسے میں وہاں ایک قہقہہ گونجا بلند بانگ.... طویل اور پاگلوں جیسا قہقہہ۔

محمود اور فرزانہ نے دیکھا، قہقہہ فاروق کے حلق سے ابل رہا تھا۔

مجرم کا نام

”کیا ہوا فاروق! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“ محمود نے گھبرا کر کہا۔
 ”ہاں! میں پاگل ہو گیا ہوں، کیونکہ ان لوگوں کا سارا منصوبہ چوہٹ ہو گیا، جب کہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ کامیاب ہو گئے ہیں۔“
 ”ہائیں! چوہٹ ہو گیا، لیکن کیسے؟“ فرزانہ بولی۔
 ”ان کے پیچھے دیکھو، سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔“ فاروق نے پیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

”نہ صرف محمود، فرزانہ اور تین قیدیوں نے بلکہ انسپکٹر فیروز اور ارسلان تیمور، استاد اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے بھی فوری طور پر گھوم کر دیکھا، دوسرے ہی لمحے وہ سب کچھ جان گئے، کیونکہ محمود، فاروق اور فرزانہ نے آندھی اور طوفان کی طرح شین گن والوں پر چھلانگیں لگائی تھیں، ساتھ ہی محمود چلا یا۔“
 ”ساتھیوں ان پر ٹوٹ پڑو، ورنہ ہم سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔“
 تین قیدی زور سے چوکنے اور پھر جیسے انہیں عقل آگئی، وہ چیختے چلاتے ان ظالموں پر ٹوٹ پڑے۔

انسپکٹر فیروز اور اس کے ساتھیوں کی بوکھلاہٹ کا کیا پوچھنا، اس بوکھلاہٹ کا فائدہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو پہنچا، زبردست جدوجہد کے بعد انہوں نے شین گنیں

چھین لیں، لیکن ان لوگوں پر بھی جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی، وہ ان سے بھڑے گئے... لپٹ گئے، انہوں نے اشین گنوں کی بھی پروا نہ کی، محمود، فاروق اور فرزانہ نے جب یہ دیکھا تو شین گنوں کو شین گنوں کی بجائے لٹھیوں کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا، پھر تو جس کے بھی سر پر دستہ لگ گیا، وہ چیخ مار کراٹ پڑا، چیخ و پکار کا ایک عالم جیل کی فضا پر چھا گیا، ادھر تین کے تین قیدی بھی اپنے مجرموں کو بُری طرح جھنجھوڑ رہے تھے، ان کے ہتھے بڑبڑا رہے تھے، اس کا شر بُرا ہی ہوا۔

یہ ہنگامہ چند منٹ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا، انہیں جکڑ لیا گیا اور جب وہ حالات پر قابو پا کر سکون سے بیٹھے تو انہیں فاروق کا قبضہ یاد آیا۔
 ”اُف خدا! اگر عین وقت پر فاروق وہ قبضہ نہ لگاتا تو خدا جانے اس وقت منظر کیا ہوتا۔“ محمود کے منہ سے نکلا۔

”واقعی اس وقت فاروق کی تعریف نہ کرنا اسکے ساتھ انصافی ہو گئی۔“ فرزانہ بولی۔

”شکریہ! میں اس قابل کہاں، دراصل یہ حقیقت ہے، اس وقت میرا دماغ مل گیا تھا، اور وہ قبضہ دراصل موت کے خوف کی پیداوار تھا۔“ فاروق نے کہا۔
 ”گو یا تم خوف زدہ ہو گئے تھے۔“ محمود نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔
 ”ہاں! موت مجھے آنکھوں کے سامنے نظر آگئی تھی، بس میں پاگلوں کی طرح ہنس پڑا، لیکن پھر فوراً ہی وہ خیال سو جھ گیا۔“

”بہر حال جو بھی ہوا، خوب ہوا اور اب ہمیں ابا جان کا انتظار کرنا ہے۔“
 ”ٹھیک ڈیزہ کھینے بعد انسپکٹر جمشید کی واپسی ہوئی اور جب انہیں نئے واقعے کا علم ہوا تو وہ پہلے تو سکتے میں آ گئے اور پھر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔
 ”چلو اب انسپکٹر فیروز اور شوفا کی تلاش کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔“ انہوں نے سکون کا

سانس لیا۔

”لیکن ابا جان! انسپکٹر فیروز کا بیان ہے کہ منصوبے بنانے والے کوئی اور ہی ہے۔“

”اوہ! کیا یہ سچ ہے انسپکٹر صاحب!“ انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں! منصوبہ بنانے والا کوئی اور ہے، تمام رقم کا چوتھا حصہ دینا پڑتا۔“

”وہ کون ہے؟“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”ہم نہیں جانتے۔“ اس نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ انسپکٹر جمشید نے انہیں گھورا، اس پر شوفانے یہ کہانی سنائی۔

”ہم چھوٹی موٹی چوریاں کیا کرتے تھے اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہوٹل انصار میں تھا،

ایک دن ہمیں ایک لفافہ ملا، اس میں لکھا تھا کہ لفافہ بھیجنے والا انہیں ایک ایسی ترکیب بتا

سکتا ہے، جس سے وہ ایک کروڑ روپے حاصل کر سکتے ہیں اور روز روز کی چوری سے بچ

سکتے ہیں، منصوبہ اتنا زبردست ہے کہ پولیس کا بھی کوئی خوف نہیں رہے گا، اگر تم

منصوبہ جانا چاہتے ہو تو دوسرے دن دوسری منزل کے کمرہ نمبر ۲۱ میں آ جائیں، ہم

دوسرے دن ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے، وہاں پھر ایک لفافہ ملا، اس میں اس

سارے منصوبے کی تفصیل تھی، اس جیل کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، اسی

کے ذریعے سے معلوم ہوا، یہ بھی لکھا تھا کہ اس منصوبے میں کامیابی اس وقت ممکن

ہے، جب یہاں کے پولیس انسپکٹر فیروز کو ساتھ ملا لیا جائے اور وہ رشوت خور ہے،

ضرور ساتھ مل جائے گا، ہم خود کئی بار اسے رشوت دے کر اپنے آپ کو بچا چکے تھے،

منصوبہ بنانے والے نے لکھا تھا کہ کامیابی کے بعد چوتھائی رقم اسے دی جائے گی، کس

طرح دی جائے گی، اس کا طریقہ وہ بعد میں بتا دے گا اور یہ کہہ کر انہوں نے اسے

دھوکا دینے کی کوشش کی تو وہ ان کا راز پولیس کو بتا دے گا اور اس طرح وہ پولیس سے

ساری عمر چھپتے پھریں گے، لیکن اسے حصہ دینے کی صورت میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا، وہ پورے اطمینان سے عیش کر سکیں گے، بات معقول تھی، میں انسپکٹر فیروز سے جا کر ملا، انہیں ساری تفصیل بتائی، پہلے تو یہ سوچ میں پڑ گئے، پھر ساتھ شامل ہونے پر تیار ہو گئے، ہم نے جا کر جیل کا معائنہ کیا، وہ بالکل جیل تھی اور درست حالت میں تھی، ہمیں منصوبہ قابل عمل نظر آیا اور آخر اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا، ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، منصوبہ کس نے بتایا ہے اور نہ اب تک معلوم ہو سکا، اس دوران ہمیں کمرہ نمبر ۲۱ کے ذریعے برابر ہدایات ملتی رہی ہیں اور ہم ان پر پوری طرح عمل کرتے رہے ہیں پھر وہ ہمیں بتا دیتا کہ اسے اس کا حصہ کس طرح ادا کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر شوفان خاموش ہو گیا۔

”کیا اس کی وہ ہدایات تمہارے پاس موجود ہیں۔“

”نہیں! ہر خط میں یہ ہدایات بھی ہوتی تھی کہ خط پڑھنے کے بعد جلا کر رکھ فضا

کر دی جائے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہوں اس کا مطلب ہے، وہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہے، اور خود کو صاف

بچالے جانا چاہتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا ان لوگوں پر قلم اسی کی وجہ سے ٹوٹا ہے،

میں اسے معاف نہیں کروں گا۔“

”آپ... آپ کون ہیں۔“ انسپکٹر فیروز ہکھلایا۔

”اس بات کا پتا تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لگے گا۔“

انہوں نے کہا اور ان لوگوں کو اشارہ کیا جنہیں ساتھ لے کر آئے تھے، وہ فرح

آباد کے ایس پی سے جا کر ملے تھے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد مختصر طور پر انہیں

سارے حالات کہہ سنائے تھے، ایس پی نے اسی وقت گاڑیوں کا بندوبست کیا تھا اور

خود بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا، اس وقت بھی ایس پی ان کے ساتھ کھڑا تھا اور نفرت بھری

نظروں سے انسپکٹر فیروز اور دوسروں کو دیکھ رہا تھا۔

”ان لوگوں کو اس طرح لے جا کر بند کریں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ان مظلوم لوگوں کو بھی فی الحال اپنے پاس بطور مہمان رکھیں۔“

”اچھی بات ہے، لیکن آپ کرنا کیا چاہتے ہیں۔“

”اسے گرفتار کیے بغیر مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔“ جس نے یہ سارا گل کھلایا ہے، اگر وہ آزاد رہ گیا تو اس قسم کا کوئی اور منصوبہ بنائے گا۔“

”لیکن اس کا تو کوئی پتا نہ نشان، نہ کوئی سراغ، آپ کس طرح اس تک پہنچیں گے۔“

”شوقا کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر کے۔“ انسپکٹر جشید مسکرائے۔

☆☆

ہوٹل انصار میں شوقا، انسپکٹر فیروز، ارسلان تیمور اور اس کے دو ساتھی داخل ہوئے، ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے سوٹ کیس تھے، وہ گاؤنٹر پرز کے بغیر آگے بڑھ گئے، گاؤنٹر کلرک نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر بڑبڑایا:

”شاید آج پھر زردار کمیشن بنے گی۔“

”وہ پانچوں لفٹ میں سوار ہو کر دوسری منزل پر اترے اور کمرہ نمبر دوسو دس کے دروازے پر پہنچے، انہوں نے چابی لگائی اور دروازہ کھول دیا، اندر کوئی نہیں تھا، شوقا نے جلدی جلدی ایک کانٹہ پر چند سطریں لکھیں، اسے ایک لفافے میں ڈالا اور میز پر رکھ دیا، پھر وہ کمرے سے نکل آئے اور کمرہ نمبر دوسو گیارہ میں داخل ہو گئے، آدھ گھنٹے بعد شوقا اٹھا اور پھر کمرہ نمبر ۲۱۰ میں داخل ہوا، یہاں سے وہ لفافہ غائب تھا اور اس کی جگہ ایک اور لفافہ رکھا تھا، اس نے لفافے میں سے کانٹہ نکالا اور اسے کھول کر پڑھا، لکھا تھا۔“

”سب لوگ اسی کمرے میں آجاء، میں اپنے حصے کی رقم سب کے سامنے وصول کروں گا۔“

شوقا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ طاری ہو گئی اور پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی اسی کمرے میں بلا لیا، پھر سڑک کی طرف کھٹنے والی کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور کچھ اشارہ کیا، کھڑکی بند کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر کرسیوں پر بیٹھ گیا، منہ سے کسی نے بھی کوئی لفظ نہ نکالا، اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا، انہوں نے دیکھا، وہ ہوٹل انصار کا گاؤنٹر کلرک تھا۔

”دوستو! میں آگیا ہوں، شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ وہ منصوبہ میں ہی بنایا تھا، مجھے خوشی ہے کہ منصوبہ کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا، میں نے اپنے آپ کو تم سب پر اس لیے ظاہر کر دیا ہے کہ اب ہم اس منصوبے میں برابر کے شریک ہیں، میں نے یہ سارا راز لکھ کر بند لفافے میں اپنے بنک منیجر کے حوالے کر دیا ہے اور اسے یہ ہدایت کر دی ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو لفافہ پولیس کے حوالے کر دے، لہذا اگر تم نے مجھ سے دھوکا کرنے کی کوشش کی تو تم سب گرفتار کر لیے جاؤ گے، لہذا میرا حصہ میرے حوالے کر دو، کیونکہ یہ منصوبہ میرے ہی ذہن کی پیداوار ہے، دراصل یہ میرا کمیشن ہے، جو میں تم سے وصول کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی، آخر شوقا کے ہونٹ ہلے:

”ہم تمہیں تمہارا حصہ ہی دینے آئے ہیں، تمہیں اپنے حصے کی سزا تو جگہ جگہ چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ زور سے چونکا۔

”مطلب یہ کہ تمہارا منصوبہ بڑی طرح فیل ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے شوقا نے

وہاں سے واپسی پر انہوں نے فاران قیصر اور اس کے دوست کو ساتھ لے لیا۔ رقوم کا حساب کتاب بعد میں ہونا تھا اور عدالت میں کیس ختم ہونے کے بعد انہیں ملنا تھیں، لیکن انہیں رقوم کی کیا فکر رہی تھی، زندگی بچ گئی اور وہ بے حد خوش تھے، جیپ میں سوار ہوتے وقت انسپکٹر جمشید بولے:

”مسٹر فاران: میں دارالحکومت جا کر آپ کے والد کو فون کروں گا اور ان سے کہوں گا کہ غریبوں سے نفرت کرنا چھوڑ دیں، غریب دوست امیر دوستوں سے بہتر ہوتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیل کی سختیاں آپ کے حصے کی بھی اختر عباس جھیلے رہے ہیں۔“

”اس میں کیا شک ہے، یہ بات تو میں نہ جانے کتنی مرتبہ ڈیڈی سے کہہ چکا ہوں۔“ فاران قیصر نے کہا۔

”لیکن انہوں نے تمہاری بات نہیں سنی، لیکن اب وہ ضرور سنیں گے اور ابھی ہمیں ایس پی عمر فرید کو جا کر یہ بتانا ہے کہ بے گناہوں کو گرفتار کرنے سے کیس حل نہیں ہوا کرتے، کیس کی باقاعدہ تفتیش کر کے ہی حل ہوتے ہیں۔“

”اور میں بھی آپ لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“ فاروق بول پڑا۔

”ایک نہیں سو کہو۔“ انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

”سو.... ابا جان آپ نے اسے یہ کیا اجازت دے دی، اگر یہ سو باتیں کہنے پر آیا تو سارا راستہ ہم زبان ہلا بھی نہ سکیں گے۔“ فرزانہ گھبرا کر بولی۔

”خیر خیر.... فی الحال تم نہ گھبراؤ، میں ایک ہی بات کہوں گا اور وہ یہ کہ یہ ایک ایسا کیس ہے جس کے مجرم کا نام ہمیں اب تک معلوم نہیں ہے، اگرچہ ہم مجرم کو گرفتار کر چکے ہیں۔“

اور وہ چونک اٹھے، پھر بے ساختہ مسکرانے لگے، واقعی وہ اصل مجرم کا نام معلوم

اپنے چہرے سے میک اپ اتار دیا۔ کاؤنٹر کلرک چلا اٹھا۔

”نواب عرفان علی... تم.... تم۔“

اسی وقت دروازے کی طرف سے آواز آئی:

”ابا جان! کیا ہم اندر آ سکتے ہیں۔“

”ہاں ضرور! کھڑکی سے میں تمہیں اشارہ کر رہی چکا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”ادھر کاؤنٹر کلرک کے چہرے پر حیرت کا ایک جہاں نظر آ رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے۔“ آخر اس نے چلا کر کہا۔

”شوقا، انسپکٹر فیروز اور ارسلان تیمور گرفتار ہو چکے ہیں، ہتھیاری جانے والی تمام

رقم اب سرکاری امانت خانے میں محفوظ ہے، وہ جس جس کی ہے، انہیں لوٹا دی جائے گی، تمہیں گرفتار کرنا باقی تھا، لہذا مجھے شوقا کے میک اپ میں یہاں آنا پڑا، نہ صرف مجھے بلکہ ان لوگوں کو بھی باقیوں کے میک اپ میں آنا پڑا، تاکہ تمہیں کوئی شک نہ ہو۔“

”اوہ! اس کا چہرہ تاریک ہو گیا، پھر اچانک سنبھل کر بولا۔

”لیکن تم.... تم ہو کون؟“

”خاکسار کو انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے۔

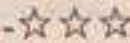
”نہیں!!“ کاؤنٹر کلرک کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

”جی ہاں! اور ثبوت تم خود لکھ کر بینک منیجر کو دے چکے ہو، اگر نہ دیتے، تو بھی اس

کمرے میں ہونے والی گفتگو ٹیپ ہو چکی ہے، میرے ساتھیوں میں سے ایک کے ہاتھ میں جو گھڑی ہے، وہ دراصل ایک مائیکروفون ہے اور اس کے ذریعے سے میز کے نیچے رکھے ہوئے منہ سے ٹیپ ریکارڈر پر آوازیں ٹیپ ہو چکی ہیں۔“

کاؤنٹر کلرک لڑکھڑا گیا، اس کا چہرہ تاریک ہو گیا، اسی وقت انسپکٹر جمشید کے ساتھ آنے والوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

کرنا بھول ہی گئے تھے۔



اس ماہ شائع ہونیوالا اگلا ناول

عمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز کے کارنامے نمبر 74

39/-
روپے

تیسرا آدمی

- ☆ محمود اور فاروق کی ایک پراسرار لڑکی سے ملاقات.....
- ☆ لڑکی کو ایک بہت ہی خوفناک بات معلوم تھی.....
- ☆ اور وہ بات اس نے ان دونوں کو بتادی.....
- ☆ ایک مکان کا قصہ جس میں رات کے وقت تین آدمی داخل ہوئے تھے.....
- ☆ لیکن ان میں سے صرف دو باہر نکلے دیکھے گئے، تیسرا آدمی مکان سے باہر نہیں نکلا.....
- ☆ وہ اس تیسرے آدمی کی تلاش میں نکلتے ہیں.....
- ☆ تیسرا آدمی کون تھا.....؟
- ☆ ایک ایسی پراسرار اور حیرت انگیز کہانی جو آپ کو جنم جو کر دکھ دے گی اور آخر میں آپ اچھل ہی تو پڑیں گے.....

اشتیاق احمد کے دلچسپ، حیرت انگیز، منہنی خیز، بنگ ساراء اور جاسوسی سے بھرپور ناول

نام نمبر	منہنی خیز ناول	منہنی خیز ناول	منہنی خیز ناول
150/-	دلہن کا سہرا	39/-	بکس کا کار
120/-	سازش کا اڈا	39/-	آن کے کارنامے
150/-	واپسی کی رشتہ	39/-	پہلا قدم
120/-	خزانے کا طوفان	39/-	پہلا قدم
120/-	پیشانی کا زخموں	39/-	پہلا قدم
130/-	جڑواں اور ان کا راز	39/-	پہلا قدم
130/-	مستعدی کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
130/-	آسمان میں پرواز	39/-	پہلا قدم
130/-	سولہ سو سو	39/-	پہلا قدم
130/-	اکبر و انیس	39/-	پہلا قدم
130/-	پیشانی کا زخموں	39/-	پہلا قدم
170/-	دور و بیدار	39/-	پہلا قدم
170/-	سوتیلے گھر	39/-	پہلا قدم
170/-	نکاح و رشتہ	39/-	پہلا قدم
170/-	اندر سے کاغذ	39/-	پہلا قدم
180/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
180/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
180/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
180/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
140/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
140/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
140/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
140/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
79/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
79/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
89/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
89/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
89/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم
65/-	پہلوں کا رشتہ	39/-	پہلا قدم